پچیسواں سفر ۔ جدّہ دوبارہ

فرینکفرٹ سے کراچی جاتے ہوئے جدّہ میں صرف ایک رات اور دو دن رُکنے کا ارادہ تھا لیکن جدّہ ہم ۲۴/ مارچ کی رات کو کافی دیر سے پہنچے تو پہلا دن اِسی میں ضائع ہوگیا۔ دوسری صبح ہم نے محض تکلّف میں بسکٹ کھائے، چائے پی، اور مکّہ جانے کے لئے ٹیکسی لی۔ اس مرتبہ یہاں گرمی بہت تھی۔ مارچ ختم ہونے کو تھا، اور ریگستان اپنی اصلیت دکھانے لگا تھا۔ سارے راستے ڈرائیور نے ایئر کنڈیشنر پوری طاقت سے چلائے رکھا اور پنکھا بھی اونچی رفتار پر رکھا تب کہیں جا کر سکون رہا، ورنہ تو اِس ریگستان میں اس کار کے مسافر لوہے کے اِس پنجرے میں پگھل جاتے۔ میقات سے ہم نے دوبارہ لبیک کی تکبیر شروع کی۔ مکّہ پہنچے تو ابھی صبح ہی تھی۔ زیادہ لوگ نہیں تھے۔ ہم نے بہت کم وقت میں ایک عمرہ مکمل کیا۔ طواف کے دوران اس دھوپ اور گرمی میں بھی فرش ٹھنڈا لگا۔ اندر صفّا اور مروہ کے درمیان سعی کی تو وہاں گرمی کا احساس بالکل نہیں ہوا۔ تقریباً ۳/ بجے ہم نے مکّہ چھوڑا اور وعدہ کیا کہ ہم یہاں دوبارہ ضرور آئیں گے۔

مکّہ چھوڑتے ہوئے ہم نے دیکھا کہ آس پاس ہر طرف بڑے ہوٹلوں کی بنیادیں پڑ رہی تھیں۔ شاہی خاندان کے لئے ایک بڑی عمارت الگ بنی تھی۔ سعودی عرب کے پاس تیل کی پیداوار نئی اِن کے اپنے انتظام میں آئی تھی۔ اس سے پہلے ساری آمدنی امریکی، برطانوی اور ڈچ تیل کمپنیوں کے قبضے میں تھی۔ سعودی عرب کی حکومت کو اس آمدنی میں سے صرف معمولی حصّہ ملتا تھا۔ ۱۹۷۵ء میں تیل کی پیداوار پوری سعودیوں کی ہوگئی تھی اور پیسے کی یہ ریل پیل ہر طرف نظر آ رہی تھی۔ ہم یہی سوچتے ہوئے ٹیکسی میں جدّہ پہنچے۔

شام کو صرف آرام کیا۔ اب سفر کا اِختتام تھا۔ بعد میں ٹیلی ویژن دیکھتے رہے۔ اسی مہینے کیمپ ڈیوڈ میں مصر اور اسرائیل کے سمجھوتے کے بعد مصر نے اسرائیل کو تسلیم کر لیا تھا اور سفارتی تعلقات قائم کر لئے تھے۔ اس حرکت سے سعودی عرب اور مصر کی حکومت کے تعلقات بگڑے اور سعودی عرب نے مصر سے سفارتی تعلقات توڑ لئے تھے۔ دوسری طرف ایران میں آئت اللہ خمینی کی حکومت قائم ہو رہی تھی اور وہاں ایک بہت بڑی تبدیلی آ رہی تھی۔ شاہِ ایران رضا شاہ پہلوی، شاہ پور بختیار کو حکومت دے کر خود ملک چھوڑ گئے تھے۔ اب آقائے خمینی کے اختیار میں ملک کو اسلامی ریپبلک قرار دیا جانے والا تھا۔ شمالی اور جنوبی یمن ایک دوسرے کو تباہ کرنے کے عزم کئے ایک دوسرے پر حملے کر رہے تھے اور امریکہ سعودی عرب میں اپنے طیارے لا رہا تھا۔ بس ٹیلی ویژن پر اسی قسم کی خبریں آ رہی تھیں، وہ بھی ڈھکے چھپے انداز میں، کہ یہاں خبروں پر بہت سخت پابندی تھی۔

ہماری پرواز کا وقت ۲۵/ مارچ کی رات کے ۱۱/ بجے تھا۔ مسعود، اُن کی بیگم اور بچے سب ہمیں چھوڑنے ہوائی اڈّے تک آئے تھے۔ بچے ہم سے بہت مانوس ہو گئے تھے۔ یہاں سے پی آئی اے کی پرواز تھی۔ اِن کے جہاز اکثر دیر سے چلتے تھے۔ شمس کے مطابق وجہ یہ تھی کہ پی آئی اے کے پاس گنتی کے چند جہاز تھے۔ اگر دن میں ایک پرواز کو بھی دیر ہو گئی تو پورے دن کی پروازیں متاثر ہوتی تھیں۔ ہماری اِس پرواز میں بھی کچھ دیر ہوئی، اور پھر اس کا وقت صبح کے ۳/ بجے کر دیا گیا۔ یہ اِن کے اخلاق کی وسعت تھی کہ مسعود اور اُن کے بیوی بچے ہمارے ساتھ بیٹھے رہے۔ ۲۶/ مارچ کی صبح ۲/ بجے ہم جہاز میں سوار ہوئے تو ہم دو نفوس سمیت، جہاز میں کل ۱۳/ مسافر تھے۔ صبح ۱۰/ بجے ہم کراچی میں اپنے گھر میں پہنچے تو پورے محلّے کے ملنے والے ہمیں مبارکی دینے کے لئے گھر میں موجود، کہ ہم عمرہ اور زیارتیں کرنے کے بعد آئے تھے۔ سارا دن داستانِ سفر گوئی میں نکل گیا۔ کئی دن اسی کی گہما گہمی، اور تصویروں پر تبصرے چلے۔ پھر ہم کراچی اور پاکستان کے اپنے ہنگاموں میں لگ گئے۔ افغانستان میں ہنگامے جاری تھے اور وہاں سے افغانی بھاگ کر کراچی میں ہجرت کر رہے تھے۔ افغانستان میں کسی امین صاحب کی حکومت آ گئی تھی۔

ہمارے آنے کے چند ہی دنوں کے بعد ۴/ اپریل ۱۹۷۹ء کی صبح خبر سنی کہ ذوالفقار علی بھٹو کو جنرل ضیاالحق کے حکم پر اس دن کی صبح کو پھانسی دے دی گئی تھی۔ ہر طرف فوجی نظر آ رہے تھے اور بڑے پیمانے پر پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی تھی۔ ہر فرد جو کسی بھی صورت میں بھٹو کا حامی سمجھا جاتا تھا، یا تو جیل میں تھا، یا ملک کے باہر۔

چھبیسواں سفر ۔ دوبارہ رامپور

ہماری زندگی کے سارے سفر ذاتی نوعیت کے تھے۔ہمیں نہ کاروبار یا ملازمت کے سلسلے میں کسی میٹنگ میں شرکت کے لئے جانا پڑا اور نہ ہم کبھی کسی عہدے پر فائز رہے۔ ہمارا سب سے بڑا عہدہ تھا گھر کی امّی ہونا۔ہم صرف گھر کے حالات اور ملکی حالات کے اتار چڑھاؤ کی وجہ سے اِدھر اُدھر ہوتے رہے ہیں۔سفر کی بھاگ دوڑ کو ہم خوشی سے نباہتے رہے۔اب بچّے بڑے ہو گئے ہیں، پڑھ لکھ گئے ہیں، اور ان کی اپنی ذمّہ داریاں ہوگئی ہیں۔سب بہن بھائیوں کی اپنی اپنی زندگی کی راہیں بننے لگی ہیں لیکن ہم نے جو طرح ڈالی تھی یہ اسی طرح سے نباہ رہے ہیں۔رہن سہن تو بدلتے رہتے ہیں اور فاصلے بھی بڑھ جاتے ہیں، مگر دلوں میں فاصلے نہ ہوں تو دل جڑے رہتے ہیں اور وہ وقت آتا ہے کہ سب مل جاتے ہیں۔

۱۹۷۰ء میں لاہور سے کراچی آنے کے بعد ہم نے ۱۹۷۹ء تک کوئی سفر نہیں کیا تھا۔ہم بھول ہی گئے تھے کہ ہمیں سفر کرنے کا شوق تھا۔اب جو ہم مشرقِ وسطیٰ اور یورپ کا دورہ کر کے واپس آئے تو پھر دل چاہنے لگا کہ دوبارہ سفر کیا جائے۔ ہمارے پاسپورٹ پر ہندوستان کی تجدید کا ایک سال ختم ہونے والا تھا لہذا ہم نے نئے سرے سے پاکستانی حکومت کو جرمانہ ادا کر کے پاسپورٹ کی مزید ایک سال کی تجدید کروالی۔ہم پاسپورٹ کی اِس سالانہ تجدید کو جُرمانہ ہی تصوّر کرتے ہیں کہ اِس کا اطلاق صرف اُن پر تھا جو اپنے خاندان سے ملنے ہندوستان جاتے تھے ورنہ ہندوستان اور پاکستان میں تجارت اور سیاحت تو صفر ہی تھی۔بہرحال ہندوستان کے سفارتخانہ نے ہمیں ۹۰ روز کا ویزا دیا جو کہ صرف رامپور کے لئے تھا۔

ہم چاہتے تھے کہ ہندوستان گئے تو وہاں روزمرّہ کے خرچ کے پیسے اپنے ہی لے کر جائیں۔ ویزا اور پاسپورٹ کی شرطوں کے علاوہ پاکستان نے ہندوستان جانے والوں کو تکلیف دینے کے لئے یہ بھی شرط لگا دی تھی کہ کیونکہ ہم اِس سال مارچ میں ایک اور سفر کر چکے تھے، لہذا ہم پیسے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ ہمارا ہمیشہ سے یقین تھا اور اسلامی نظریہ بھی یہ ہے کہ ہم نے جو پیسے کمائے، اُس پر ٹیکس اور فطرہ نکالا، اور اُس کے بعد اُن پیسوں کا ہم جو چاہے کریں اور جہاں چاہیں لے جائیں، کہ وہ ہماری ملکیت ہیں، کسی بھی حکومت کی نہیں۔ اِن معاملات میں امریکی قوانین اسلامی اُصولوں سے زیادہ مطابقت رکھتے ہیں بنسبت کسی بھی دوسرے اِسلامی ملک کے۔ پاکستانی حکومت کو بھی اِس کا احساس اب ہوا ہے جب ورلڈ بینک اور بین الاقوامی دولتی فنڈ (IMF) کے دباؤ سے انہوں نے ملک سے پیسہ لانے اور لے جانے کی شرطیں بہت نرم کر دی ہیں یا ہٹالی ہیں۔

اب ہماری صورتحال یہ تھی کہ ویسے تو تمام اخراجات کی ذمّہ داری ہماری بہن اور ان کے لڑکے ہی لیتے لیکن پھر بھی انسان بالکل خالی ہاتھ کیسے جا سکتا ہے۔ یہی سوچتے ہوئے ویزا ملے بھی پندرہ دن گزر گئے۔ جب کچھ صورت نظر نہیں آئی تو ہم نے بغیر پیسے لئے ہندوستان جانے کا ارادہ کر کے ایک دن کی نشست مخصوص کروالی۔ لیکن اس دن پھر خیال ہوا کہ ہندوستانی رقم کے بغیر یہ سفر ایک بہت بڑا حادثہ ہوگا۔ لہذا اس دن کی نشست منسوخ کروا کر دوسرے دن کی نشست مخصوص کی۔ دوسرے دن بھی ہم نے مزید سوچنے کا وقت لیا اور اپنا سفر شروع نہیں کیا۔ تیسرے دن ہماری ایک جاننے والی نے ہماری پاکستانی رقم ہم سے لی اور اسے ایک پولی اتھلین کی تھیلی میں رکھ کر اچھی طرح بند کر دیا۔ پھر اس تھیلی کو چائے کی تھرماس میں شیشے کی بوتل کے نیچے رکھ کے اوپر تھرماس کی شیشے کی بوتل کس دی اور اس میں چائے بھر دی۔ ہوشیار ترکیب کر رہی تھیں لیکن یہ غالباً بہت پرانی تھی۔ ہمارے ایک عزیز رامپور سے کراچی آئے ہوئے تھے اور اب واپس جا رہے تھے، سو یہ بہادر حضرت تھرماس لے جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ ہم اس سے کچھ خوش اور بہت پریشان ہو کر اِن کے ساتھ روانہ ہوئے تو تاکید ہوئی کہ چائے کا خیال رکھیں کہ تھرماس بھری رہنا چاہیئے۔

ہم ۱۴/اگست ۱۹۷۹ء کی صبح ۸/ بجے کراچی سے روانہ ہوئے۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ حیدرآباد کے اسٹیشن پر ڈبّے میں کچھ بچّے چوڑیاں اور مٹّی کی رکابیاں بیچنے داخل ہوئے۔ ایک پر بڑی خوبصورتی سے اللہ لکھا ہوا تھا، دوسری پر محمّد۔ ہم نے یہ دونوں رکابیاں خرید لیں۔ کچھ چوڑیوں کے جوڑے لئے اور ان سب چیزوں

کو اپنی باسکٹ میں رکھ کر باسکٹ اوپر کی برتھ پر رکھ دی۔ ساتھ میں تھرماس والی باسکٹ بھی رکھی تھی۔ اُن دنوں پاکستان ٹیلی ویژن سے ''دبئ چلو'' نامی ایک ڈرامہ آرہا تھا جس میں اسی صورت کے ایک مسافر کا ذکر تھا۔ غرض ہم برتھ پر لیٹے اور پھر سوئے تو لاہور کے قریب اٹھے۔ واہگہ پہنچے تو دیکھا کہ پاکستانی سرحدی دفتر اب ایک پختہ عمارت میں تھا۔ ایک معقول ریستوراں بھی تھا۔ کسٹمز پر ایک افسر نے ہمارے ساتھی سے ہماری تھرماس مانگی تو ہم نے سانس لینا کچھ عرصہ کے لئے ملتوی کر دیا۔ انہوں نے خاموشی سے تھرماس حوالے کر دی۔ اتنے میں اُن افسر صاحب کے ایک دوست آ گئے اور ''یاراں'' کا باآوازِ بلند نعرہ مار کے باتیں کرنے لگے۔ یہ افسر صاحب باتوں میں ایسے مشغول ہوئے کہ کام بھول گئے اور تھرماس ایسے ہی واپس کر دی۔ ہمیں فراغت ملی، سانس اور آکسیجن دوبارہ شروع ہوئی۔

واہگہ بارڈر ۔ پاکستان کی سرحدی چوکی۔ یہ ایک نئی عمارت ہے جو ہم نے پہلی مرتبہ اپنے ۱۹۷۹ء کے سفر میں دیکھی۔ پہلے یہاں پر صرف چھپر اور جھگیاں تھیں۔

اس وقت ہم اکیلے تھے، کوئی بچّے بھی ساتھ نہیں تھے اور نہ ہی کوئی زیادہ سامان تھا۔ ہندوستان میں اٹاری پر بھی اب ایک عمارت تھی۔ کسٹمز اور دخول کے افسران بھی نسبتاً معقول تھے۔ بعد آزادی، شروع کے دنوں میں لوٹ مار اور رشوت ستانی مذہبی، سیاسی، اور لالچ کی بناء پر ہوتی تھی۔ اب یہ صرف لالچ کی بناء پر ہوتی تھی، لہذا کمی صاف محسوس ہوئی۔ پلیٹ فارم پر ایک چھجے کے نیچے کئی میزیں پڑی تھیں جہاں ہندوستانی دخول کے افسران پاسپورٹ اور ویزا کی جانچ پڑتال کرنے کے لئے تشریف فرما تھے۔ ہم قطار میں لگے، اپنا پاسپورٹ ایک میز پر جمع کرایا اور قطار سے الگ کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگے۔ اس میز پر افسر ایک سردار جی

تھے۔اب ہم وہاں کھڑے رہے، اور دوسرے مسافر آتے رہے اور پاسپورٹ پر مہر لگوا کر جاتے رہے۔ہم نے دیکھا کہ ایک اور صاحبہ اپنی چار بچّیوں کے ساتھ کھڑی تھیں اور انہیں ہم سے بھی زیادہ دیر ہوگئی تھی۔ایک گھنٹہ گزر گیا۔ہم نے اُن سردار جی سے پوچھا کہ ''یہ کیا ہے کہ دوسرے آکر جا بھی چکے اور ہم ابھی تک کھڑے ہیں؟''۔اسی اثناء میں ایک مسافر ایک قلی کے ساتھ آئے، پاسپورٹ میں دس روپے کے نوٹ کے ساتھ۔ سردار جی نے ان کے پاسپورٹ پر فوراً مہر لگائی اور وہ صاحب یہ جا وہ جا۔ہم نے سردار جی پر بہت غصّہ کیا۔ اس بات پر نہیں کہ پیسے کیوں لے رہے تھے، بلکہ اس بات پر کہ رشوت مانگنا تھی تو پہلے مانگتے، انتظار کیوں کروایا۔ہم نے دس روپے اور ان دوسری صاحبہ نے پچاس روپے سردار جی کو بخشے۔سردار جی نے فوراً پیسے ہمارے ہاتھ سے جھپٹے اور ساتھ کی دراز میں ڈالے۔پھر اسی تیزی سے مہر لگا کر پاسپورٹ ہمارے حوالے کر دیئے۔ہم نے دوبارہ سردار جی کو غصّہ سے دیکھا اور پھر اُن کے پیچھے کی دیوار کو دیکھا جہاں بڑے حروف میں لکھا تھا ''ویلکم ٹو انڈیا''۔ہم نے دِل میں کہا ''شکریہ''، اور باہر نکل آئے۔

امرتسر سے کلکتہ جانے والی ہاوڑہ ایکسپریس میں اب ڈیزل انجن تھا۔بائیں طرف ایک خستہ حال بوگی (تصاویر بشکریہ نامعلوم فوٹوگرافر)۔

رات ۸/ بجے ہم ہاوڑہ ایکسپریس سے مرادآباد کی طرف روانہ ہوئے۔ٹرین کی بوگیوں کی حالت وہی ناساز تھی جو پہلے نظر آتی تھی لیکن اس دفعہ یہ برا نہیں لگا کیونکہ ہم اکیلے سفر کر رہے تھے اور بہت عرصہ کے بعد ہندوستان آنے کی خوشی بھی تھی۔دوسری صبح ۷/ بجے کے لگ بھگ رامپور پہنچ گئے۔گھر پہنچے تو سب حیران کہ ہم وہاں کیسے۔انہیں خبر تھی کہ ہمیں ویزا تو مل گیا تھا لیکن آنے کے لئے زرِمبادلہ کے حصول میں مشکل ہو رہی تھی۔ہم نے انہیں بتایا کہ اللہ نے وہ مشکل حل کرادی تھی اور کسی اور ذریعہ سے اس کا انتظام بھی ہوگیا تھا۔

سارے رشتہ دار آتے رہے اور ہم اِن سے گلے مل کر گِلے شکوے کرتے رہے۔ رات کے ۲ بجے ہمارے بھانجے بولے، ''خالہ جان، کتنے بجے سوتی ہیں آپ؟''۔ ہم تو تیار تھے۔ اب معلوم ہوا کہ یہاں سونے کا ابھی بھی صحن میں انتظام تھا۔ ہماری یہ عادت اب ختم ہو چکی تھی اور کراچی میں پنکھا چلا کر کمرے کے اندر سونے کی عادت تھی۔ اس کی بڑی وجہ کراچی کی اوس تھی۔ کراچی میں اس قدر شبنم گرتی تھی کہ صبح تک بستر مکمل گیلے ہو جاتے تھے اور جسم میں درد ہونے لگتا تھا۔ ہم نے اپنے بھانجے سے کہا، ''اتنے بڑے آنگن میں ڈرتے نہیں تم؟ ہم کمرے کے اندر ہی سوئیں گے''۔ وہ پوچھنے لگے کہ ''پاکستان میں صحن نہیں ہوتے کیا؟'' ہم نے کہا، ''ہوتے تو ہیں، لیکن ہم آرمی کے بنگلے سے لے کر کراچی تک میں کمروں کے اندر ہی سوتے رہے ہیں، اب باہر سونا ذرا مشکل ہے۔ ہمیں نیند نہیں آئے گی''۔ ہمیں اس کا اندازہ ہونے لگا تھا کہ وقت اور فاصلے کے ساتھ ہماری بہن، بھانجوں اور ہمارے خیالات اور پسند مختلف ہو چکی ہیں۔ انہوں نے ہمارا ساتھ دینے کے لئے کمرے میں سونے کا فیصلہ کیا۔ اب یہ سب اندر آئے تو ہم نے اُن سے کہا کہ ''دروازے کی چٹخنی لگاؤ''، کہ کراچی میں تو ہم باہر کے گیٹ میں اور برآمدے کی جالی میں تالہ لگاتے تھے، اور پھر کمرے میں اندر سے چٹخنی بھی۔ ۱۹۷۹ء میں کراچی میں خاص اور پورے پاکستان میں عام طور سے جرائم بہت بڑھ چکے تھے۔ غرض یہ لوگ بھی حیران کہ خالہ کو کیا ہو گیا، لیکن ہم کمرے کو بند کر کے سونے کی عادت کے بموجب کمرہ بند کر کے ہی سو سکے۔ دوسرے دن ۲۱ رمضان تھا۔ صبح آنکھ کھلی تو سب روزے سے تھے۔ ہم نے کہا ہمیں سحری کے لئے کیوں نہیں جگایا تو کہنے لگے کہ آپ اتنی تھکی ہوئی تھیں، کیسے جگاتے۔ یہ حضرت علیؑ کی شہادت کا دن بھی تھا۔ لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔ ریاستی زمانے میں یہاں اِس دن بڑے جوش و خروش سے جلوس اور مجلس ماتم ہوتے تھے، لیکن اب بس کچھ شیعہ خاندان آپس میں مل کر ایک دوسرے کے گھر میں چھوٹی سی مجلس اور قرآن خوانی کر کے بیٹھ گئے۔ نواب کا ہاتھی خانہ بھی ختم ہو چکا تھا۔

یہاں گرمیاں زوروں پر تھیں۔ ہمیں گزرا ہوا وقت یاد آ گیا کہ ہر روز شام کو پورے صحن میں پانی کا چھڑکاؤ ہوتا تھا۔ باندوں کے پلنگ، ٹھنڈی دریاں، سفید چادریں بچھی ہوئیں، کورے گھڑوں میں لٹکن پر گھڑے اور گھڑوں کے منہ پر سفید ململ کے کپڑے بندھے ہوئے، گھڑوں کے گلوں میں موتیا کے ہار پڑتے تھے۔ روز آنہ شام کو مالن ہار دے جاتی تھی، اور ہر آٹھویں دن ہرے پتّوں والی مہندی جسے پتھر کی سل پر پیس کر ہاتھوں میں لگاتے تھے۔ یہ جگہ ابھی بھی پرانے وقتوں کی یاد دلا رہی تھی۔ اب یہ باتیں تو نہ تھیں، لیکن رشتہ دار

تھے، اوران سے ملنے ملانے میں عید بھی آ گئی۔

ہمارے شوہر اور ہمارے بہنوئی دونوں فوت ہو چکے تھے۔ بس ہم اور ہماری بہن تھے کہ ہمارے والدین بھی نہیں بچے تھے۔ پہلے جو مقام ہماری امّاں کا تھا، وہاں اب ہماری بہن تھیں۔ جن کو ہم نے بچّہ دیکھا تھا، وہ شادی والا ہو گیا تھا، جو شادی شدہ تھے، وہ بچوں والے ملے۔ سب ہماری بہن کے گھر جمع ہو رہے تھے۔ ہم نے سب بچوں کو جمع کیا اور کہا، ''سنو، جب ہم بچّے تھے تو ہمیں ایک آنہ عیدی ملتی تھی''۔ وہ پوچھنے لگے کہ آنہ کیا ہوتا ہے۔ آنہ ختم ہو کے اب صرف پیسے اور روپے رہ گئے تھے۔ ہم نے سب کو ایک ایک روپیہ عیدی دی جس سے یہ بہت خوش ہوئے۔ عیدی دینے کے بعد کھانے کا انتظام شروع ہوا۔ سویاں، دہی بڑے، دہی پھلکیاں، چھولے، کڑھی، چاول، اور میٹھی ٹکیاں، یہ سب ہماری بہن نے صبح اٹھ کر پکا کر رکھ لیا تھا۔ ہم جب ۹/ بجے جاگے تو یہ سب تیار تھا۔

عید گزری، اور ہمارے تین یا چار دن اسی میں نکل گئے۔ زندگی پھر معمول پر آ گئی۔ ستمبر ہو چلا تھا اور گرمی ابھی بھی تھی۔ پھل پکنے لگے تھے۔ آم اور امرود بازاروں میں بھرے پڑے تھے۔ ہماری بہن کے گھر میں امرود کا ایک درخت تھا۔ ایک دن ہم کمرے میں بیٹھے تھے کہ صحن کے دروازے کو ایسا لگا کہ جیسے کسی نے پتھر مارا ہو۔ باہر دیکھا تو امرود کے درخت سے ایک کے بعد دوسرا امرود نیچے گرے چلے جا رہے تھے۔ ہم نے اپنی بہن کو بلایا اور کہا، ''باجی، یہ دیکھیں، یہ امرود کیسے گر رہے ہیں''۔ ہم دونوں نے باہر آ کر غور سے دیکھا تو ایک ہنومان جی درخت کے پتوں میں چھپے ہوئے امرود کھا رہے تھے۔ ایک کھاتے، دوسرا نیچے۔ بہن نے زور سے کہا، ''ارے پکّے پکّے پھینکو، یہ کیا کچّے کچّے پھینک رہے ہو''۔ لیجیئے، اب پکّے بھی آنا شروع ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں یہ بندر صاحب پیٹ بھر کے یہاں سے روانہ ہو گئے۔ کچھ ہی دن بعد یہ پھر واپس۔ باورچی خانے میں سبزی رکھی ہوئی تھی جس پر انہوں نے حملہ کر دیا۔ ہماری بہن ڈنڈا لے کر پیچھے چلیں تو جاتے جاتے ایک آلو منہ میں اور ایک ہاتھ میں، یہ جا وہ جا، اوپر چھت پر چڑھ گئے۔ ہر وقت ہاتھوں میں چھڑی رکھنا پڑتی تھی۔ بندر پہلے بھی ہوتے تھے، لیکن ۲۰ رمیل دور، مرادآباد اسٹیشن پر زیادہ ہوتے تھے۔ اب ہندوؤں کی حکومت، گائے اور بندروں کا راج تھا۔

مسلمانوں میں کافی تبدیلی دیکھی۔ ابھی بھی ان کی آبادیاں تھیں۔ ان کی لڑکیاں پی ایچ ڈی کر

رہی تھیں۔ اس تعلیم کے بعد بھی ان کی تنخواہ سات یا آٹھ سو روپے سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ مہنگائی دہلی اور بمبئی سے کم تھی، لیکن پھر بھی تنخواہوں کے تناسب سے زیادہ لگتی تھی۔ ایک دور کے عزیز نے نکٹی جیانی کے محلّہ میں ایک بہت بڑا گھر بنوایا تھا۔ ان کے آٹھ بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ اب ان کے سارے بیٹے اب باہر تھے۔ ایک لندن میں تھے جن سے ہم لندن کے سفر میں مل چکے تھے۔ ایک لاہور گئے، ایک کراچی، غرض یہ کہ کوئی یہاں اور کوئی وہاں۔ صرف ایک صاحبزادے رامپور میں رہ گئے تھے۔ اسی طرح سارے خاندان بٹے اور بکھرے ہوئے نظر آئے جس سے رونق بہت کم ہوگئی تھی۔

ڈیڑھ مہینہ باقی ماندہ رشتہ داروں سے پرانی یادیں تازہ کر کے گزارا اور اس طرح ۲۹ ستمبر آ گیا۔ ہم اس دن واپس روانہ ہو رہے تھے۔ ہمارا سارا خاندان ہمیں چھوڑنے مرادآباد تک آیا۔ انہیں چھوڑتے وقت ہم سوچ رہے تھے کہ معلوم اب کب آنا ہوگا یہاں۔ اس کے آگے وہی امرتسر اور وہی لاہور تھا، اور وہی کراچی کا سفر تھا۔

ہندوستان کی آبادی یقیناً بہت بڑھ گئی تھی کیونکہ جب ہم ریل کے ڈبّے میں چڑھے تو اندر کا نظّارہ قابلِ دید تھا۔ پورا ڈبّہ مسافروں سے بھرا ہوا تھا اور لوگ دیواروں سے جڑے ہوئے کھڑے تھے۔ ہماری اپنی نشست کا کوئی پتہ نہیں تھا جو ہم نے خاص پیسے ادا کر کے مخصوص کروائی تھی۔ ہم بھی کھڑے ہوگئے۔ تین گھنٹے چلنے کے بعد کہیں اتنی جگہ ہوئی کہ ہماری اپنی نشست ہمیں ملی۔ یہاں ریل کا انتظام پاکستان سے کچھ خراب ہی لگا تھا۔ اب بیٹھے تو سفر کچھ بہتر لگا اور اسی طرح ہم امرتسر پہنچے۔ ایک بار بھی اٹھنے کا نہیں سوچا کہ کوئی ہماری نشست پر قبضہ نہ کر لے۔ امرتسر سے لاہور آئے تو شہنشاہ نواب کے بھتیجے حسن امین نے پھر ہمارا استقبال کیا اور ہم ان کے ساتھ ان کی والدہ کے گھر پہنچے۔ یہ قمر بیگم ہماری اچھی دوست تھیں۔ انہوں نے لڑکیوں کا ایک اسکول کھول لیا تھا اور ان کے گھر کی گلی کا نام بھی اب ان کے نام کے لحاظ سے قمر اسٹریٹ ڈال دیا گیا تھا۔ ہم ان کے گھر ایک دن رہنے کے ارادے سے آئے تھے کہ مل بھی لیں گے اور کچھ آرام بھی کر لیں گے۔

دوسرے دن ہمیں ایک نور جہاں نامی صاحبہ کے گھر ریلوے کالونی جانا تھا۔ یہ رامپور میں ہمارے ایک پڑوسی کی بہن تھیں جو بیاہ کر رامپور سے لاہور آئی تھیں۔ اب ہم آئے تو اُن کے رامپوری رشتہ دار نے ہمارے ساتھ ان کے بیٹے کی چھوچک کا سامان کر دیا تھا جو اب ہمیں اُن کو دینا تھا۔ یہاں پہنچے تو یہ سب لوگ

بہت خوش ہوئے اور دوسرے دن ہمیں پھر آنے کی دعوت دے بیٹھے۔ ہماری ٹرین کا وقت دوسرے دن شام کے ۸ر بجے کا تھا۔ ہم تیار ہو گئے۔ دوسرے دن صبح ہم نے قمر صاحبہ سے کہا کہ ''ہم نور جہاں صاحبہ کے گھر سے ہی اسٹیشن چلے جائیں گے''، اور خدا حافظ کہہ کے یہاں سے رخصت ہوئے۔

قمر اسٹریٹ کے برابر دیوسماج روڈ سے ہم نے رکشا لیا اور اس طرح نور جہاں کے گھر پہنچے۔ انہوں نے اپنے صحن میں کھانے کا انتظام کیا تھا۔ بہت بڑا صحن تھا اور اس میں آم کے درخت لگے ہوئے تھے جن کے گہرے گھنے سائے سے اکتوبر کی پہلی تاریخ کو بھی یہاں کافی ٹھنڈ لگ رہی تھی۔ ہم نے انہیں چھوچک کے کپڑے اور رتالو دکھائے۔ یہ رتالو بھی ہم رامپور سے ساتھ لائے تھے کہ یہ کراچی اور لاہور میں نہیں ملتے تھے۔ یہ اروی کی شکل کی ایک سبزی ہوتی ہے، مگر اس کا حجم اروی سے بڑا ہوتا ہے۔ انہوں نے یہی رتالو پکا کر کھلائے۔ کھانا بہت مزے کا تھا۔ کھانے کے بعد ہم نے ان سے کہا کہ ''اب ہم کچھ آرام کریں گے، کہ ٹرین میں آرام مشکل ہی ہے''۔ آرام کیا، ہم تو سو ہی گئے اور آنکھ کھلی تو شام کے ۷ر بج چکے تھے۔ پریشانی ہوئی کہ یہ ٹرین تو نکل گئی۔ ہم نے نور جہاں سے شکایت کی کہ انہوں نے اٹھایا کیوں نہیں جب انہیں علم تھا کہ ہماری ۸ر بجے کی ٹرین تھی۔ کہنے لگیں، ''آپ ایسی غافل سوئی تھیں کہ کئی مرتبہ آپ کو جگانے کی کوشش کی اور آپ کہہ دیتیں کہ ابھی اٹھتی ہوں۔ ہم نے سوچا کہ آپ بہت تھکی ہونگی، لہذا زیادہ زور نہیں دیا''۔ نور جہاں کے سسر صاحب ریلوے میں تھے۔ انہوں نے ہمیں تسلّی دی کہ دوسرے دن کی ٹرین کا انتظام کر دیں گے۔ ہم اُس رات ان ہی کے گھر ٹھہرے۔ یہ بھی بہت خوش تھے کہ اس طرح کچھ مزید رامپور کی باتیں کر سکیں گے۔ دوسرے دن پھر ۸ر بجے کی ٹرین کی نشست پکّی ہوگئی۔ اب دوسرے دن جو ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا تو پھر وہی نیند کا غلبہ۔ سوئے تو ۴ر بجے اٹھے، اور پھر سونے کا نام نہیں لیا۔ یہاں سے سب کو خدا حافظ کہہ کے اسٹیشن پر پہنچے۔ دوسرے دن کراچی میں ۱ر بجے دن گھر پہنچے۔

ستائیسواں سفر ۔ رامپور، آخری مرتبہ

کیا کہیں کہ اگر ہمیں مستقبل کی خبر ہوتی تو ہم رامپور سے واپسی کے کئی سفر ملتوی کر دیتے۔ اکتوبر ۱۹۷۹ء کے سفر سے واپس آنے کے بعد مئی ۱۹۸۰ء میں ہماری بہن کی وفات کی خبر ہم تک پہنچی۔ پھر اکیلے ہم، اور خود ہی سوگ منا کر خاموش ہو رہے۔ ہمارے سارے رشتہ دار عزیز و اقارب اور جاننے والے آتے اور تسلّی دیتے۔ لیکن کہتے ہیں کہ انسان اپنی خوشیوں میں دوسروں کو شریک کر سکتا ہے مگر دُکھ انسان صرف اکیلے ہی اٹھاتا ہے۔

دنیا اپنی روش پر روانہ رہی۔ لیکن حالات کچھ سنگین ہو گئے۔ ایران میں امریکی سفارتخانے کے سفارتی نمائندے ایرانی طلباء کی حراست میں رہے، اور ان کو آزادی دلانے کے لئے امریکی صدر کارٹر کی کوشش کافی برے طریقے سے ناکام ہوئی۔ اس وجہ سے ۱۹۸۰ء میں یہ صاحب صدر ریگن سے ہار گئے۔ اسی سال ہمارے پڑوس میں ایران اور عراق کی جنگ شروع ہو گئی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ دو مسلمان ملک کس طرح جنگ میں بھڑ سکتے ہیں۔ دوسری طرف ظلم یہ کہ پاکستان میں افغانی مہاجرین کی آمد بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ پاکستان میں جنرل ضیاء الحق نے اپنی حکومت مسلّم کر لی تھی۔ امریکہ افغانستان میں اپنی سیاست آگے بڑھانا چاہتا تھا اور اسے پاکستان کی ضرورت تھی۔

ہماری بہن کے بچّوں نے ہمیں دوبارہ رامپور آنے کی دعوت دی۔ ان کا اب کوئی بڑا نہ رہا تھا،

اور ہمیں اپنے دوسرے بھانجے کی شادی کرنا تھی۔ اسی اثنا میں رامپوری نوابی خاندان کے مرتضٰی علی خاں اپنی بیٹی مرتضیٰ بیگم عرف نگہت علی خان سے ملنے کراچی آئے۔ یہ خاتون حبیب بینک کے ایک عہدیدار انتخاب حیدر عابدی کو بیاہی تھیں۔ مرتضٰی علی خاں ہم سے بھی ملے اور ہمیں رامپور میں اپنے بیٹے کے ولیمہ میں شرکت کی دعوت دے گئے تھے۔ ہمارے اپنے بچّے اپنی مصروفیات میں گھرے ہوئے تھے، سو اکیلے جانے کا فیصلہ ہوا۔ پاسپورٹ پر مزید ایک سال کے لئے ہندوستان کی تجدید کروائی۔ یہ چکر بھی ابھی تک چل رہا تھا اور اُس کا تاوان بھی بڑھ چکا تھا۔ ہندوستانی سفارتخانے گئے تو اِس دفعہ ہمیں ویزا صرف رامپور کا ملا۔

پی آئی اے کا ایک وفادار طیارہ ، بوئنگ ۷۲۰

اس مرتبہ ہم نے کراچی سے لاہور تک ہوائی جہاز کے ذریعے سفر کیا۔ ہم کراچی سے لاہور کے بجائے براہِ راست دہلی بھی جا سکتے تھے لیکن وہاں سے ہمیں بسیں لینا پڑتیں جن پر اب سب کچھ صرف ہندی میں لکھا ہوتا تھا، اور وہ پریشانی کی بات تھی۔ امرتسر کا راستہ ہمیں اچھی طرح یاد تھا۔ پی آئی اے کے بوئنگ ۷۲۰ کی یہ پرواز ۲۶ رجنوری ۱۹۸۱ء کی صبح ۸ر بجے کراچی سے روانہ ہوئی۔ شمس ہمیں اور ہمارے سامان کو چھوڑ نے جہاز کے اندر تک آئے، اور سامان سیٹوں کے اوپر کے خانے میں رکھ کر خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔ یہ اچھے دن تھے کیونکہ جہاز اغوا کم ہوتے تھے اور سیکیوریٹی ایسی سخت نہ تھی۔ جاتے جاتے انہوں نے ایک فضائی میزبان کو ہمارا خیال رکھنے کی یاددہانی کرادی۔ یہ شاید اُنہیں جانتے تھے کہ خود بھی پی آئی اے میں کام کرتے تھے۔

ہمارے حصے میں جو طیارہ آیا یہ وہی تھا جس کی خریداری کے لئے شمس لانگ بیچ گئے تھے۔ یہ طیارہ جناب صدر ضیاء الحق مرحوم کے لئے خریدا گیا تھا۔ اُنہوں نے یہ رحم کیا تھا کہ یہ طیارہ پی آئی اے کے پاس چھوڑ دیا تاکہ یہ استعمال میں رہے۔ یہ طیارہ صرف ایک ملین ڈالر کا ملا تھا اور بہت استعمال شدہ تھا۔ اُس وقت تو ہم سوچتے تھے کہ یہ صدر صاحب کی قوم سے زیادتی ہے کہ اتنے پیسے ایک ذاتی استعمال کے طیارے پر خرچ کر رہے تھے، لیکن اب ہم دنیا کے دوسرے صدور کو دیکھتے ہیں تو ہمیں پاکستانی صدر کی غربت پر ملال ہوتا ہے۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد لاہور کے ہوائی اڈّے پر ہمیں حسن امین نے خوش آمدید کہا۔ یہ بھی پی آئی اے میں ٹریفک ڈپارٹمنٹ میں کام کرتے تھے۔ شہنشاہ نواب کے بھتیجے حسن ہمارے بہت پرانے جاننے والوں میں تھے اور ہمارے بیٹوں کے ساتھ پڑھے لکھے تھے۔ ان کے ساتھ ہم نے ٹیکسی لی اور ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوئے۔ اِس وقت ہماری آنکھوں کے سامنے ہماری پاکستان ہجرت کے وقت دہلی سے لاہور کی پرواز اور تانگے پر ہوائی اڈّہ سے ریلوے اسٹیشن کا سفر یاد آ گیا۔ تب سڑکوں کے کنارے جلی ہوئی عمارتیں تھیں، اب ماشاءاللہ ہر طرف رونق تھی۔ بارشوں کے بعد ہر طرف ہریالی تھی اور صاف اور خوبصورت عمارتیں تھیں۔ دل کو خوشی ہوئی کہ ہم ایک قوم کی حیثیت سے بہت دور تو نہیں آئے لیکن ایک ہی جگہ کھڑے بھی نہ تھے۔

ہمارے پاس تھوڑے سے کپڑے تھے۔ اس کے علاوہ دلہن کی بری کے جوڑے جو ہم نے کراچی میں اپنے ہاتھ سے تیار کئے تھے۔ یہ کپڑے ہم نے شمس کے ''ایئر لائنز کرو بیگ'' میں رکھے ہوئے تھے جس پر کئی ملکوں، کئی ہوائی جہاز کی کمپنیوں، اور کئی ہوٹلوں کی چپکنے والی تصویریں (اسٹکرز) لگی ہوئی تھیں۔ ہندوستانی کسٹمز پر اس بیگ سے کافی فائدہ ہوا۔ ہمارا بیگ دیکھ کر ایک کسٹمز افسر نے ہمیں بغیر جانچ پڑتال کے جانے دیا۔ پتہ نہیں وہ ہمیں کیا سمجھا تھا۔ اٹاری سے امرتسر پہنچے تو ہاؤڑا ایکسپریس چھوٹ چکی تھی۔ ہم اور ایک اور خاندان کے افراد اب پریشان تھے کہ کیا صورت ہو۔ ایک قلی نے ہمیں مشورہ دیا کہ ۱۰ر بجے رات کی ایک ٹرین سے انبالہ جائیں اور وہاں سے مرادآباد کی ٹرین لیں۔ سو ہم نے یہی کیا۔

ہم سب ۱۰ر بجے والی اس ٹرین میں بیٹھے۔ یہ فرسٹ کلاس کا ڈبّہ تھا۔ اس خاندان کے سب لوگ کچھ تکلیف میں نظر آ رہے تھے۔ پتہ چلا کہ سب بچوں نے ہندوستان کے لئے چلنے سے پہلے ٹیکے لگوائے تھے اور اب سب بخار میں مبتلا تھے۔ ان کے پاس کوئی دوا بھی نہیں تھی۔ ہم نے انہیں اپنے پرس میں سے بخار کی گولیاں اور چائے دی کہ یہ اپنے بچوں کو کھلا دیں۔ اس پر انہوں نے اپنے لئے بھی چائے مانگ لی۔ اب ہمارے لئے کوئی چائے نہ بچی۔ خاصے خاموش ہو کر بیٹھے تھے کہ ہمارے پاس کی کچھ سکھ لڑکیوں نے ماہیا گانا شروع کر دیا۔ یہ بھی امرتسر سے سوار ہوئی تھیں اور سارے راستے ہنسی مذاق کرتی ہوئی جا رہی تھیں۔ اس سے ڈبّے میں کچھ رونق آئی۔ اسی اثناء میں باہر دیکھا تو بارش شروع ہو گئی تھی اور ہمارا اسٹیشن بھی آنے لگا تھا۔ ہمیں یہاں اتر کر رامپور کے لئے ٹرین لینا تھی۔ یہ سکھ لڑکیاں، یہ دوسرا خاندان جس نے ہماری چائے پی لی تھی، اور ہم یہاں

اُترے اور پلیٹ فارم کے برآمدے کے نیچے بھیگتے ہوئے پہنچے۔ رات کے ۲ر بجے تھے اور ہمارے علاوہ یہاں کوئی اور مسافر نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس خاندان میں ایک صاحب، ان کی ماں، بہو، اور دو بچّے تھے۔ ان کے کہنے پر ہم نے اُن صاحب کو ٹکٹ کے پیسے دیئے اور یہ سب کے لئے ٹکٹ لینے چلے گئے۔ بہت دیر بعد آئے اور کافی دِل برداشتہ اور جھلائے ہوئے لگے۔ ٹکٹ کی کھڑکی پر کافی مجمع تھا اور یہ ٹکٹ لینے میں کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ واضح رہے کہ ایسی جگہوں پر قطار بنانے کا تصوّر ابھی عام نہیں تھا۔ یہ صاحب غصّے میں کراچی واپس جانے کو تیار تھے۔ یہ خاندان کانپور کا تھا اور آزادی کے بعد پہلی مرتبہ وہاں جا رہا تھا، غالباً ان بزرگ خاتون کے کہنے پر۔ ہم نے ان سے کہا کہ لائیے، ٹکٹ ہم لے آتے ہیں۔ ان سب سے پیسے لے کر ہم ٹکٹ کی کھڑکی کی طرف آئے تو یہاں ایک ہنگامہ ہو رہا تھا۔ ہم نے اسی ہنگامہ میں ان تمام مردوں کے درمیان سے اپنا ہاتھ بڑھایا اور پیسے سمیت کھڑکی کے اندر ٹکٹ بابو کے سامنے کر دیا۔ اُدھر سے ہمیں چھ ٹکٹ اور کچھ پیسے واپس ہوئے، اور پنجابی میں کچھ بڑبڑایا گیا جو اس شور میں ہمیں سنائی نہیں دیا۔ ہم نے ٹکٹ گنے اور چلے کہ ان لوگوں کو خوشخبری سنائیں۔ اتنے میں ٹرین بھی آ گئی اور ہم سب اس ٹرین میں سوار ہو گئے۔ اب ان صاحب کی والدہ ہم سے ٹکٹ اور اس کی قیمت کا حساب لینے لگیں۔ اب جو حساب شروع ہوا تو معلوم ہوا کہ ہمیں پیسے کچھ کم واپس کئے گئے تھے، یا یہ کہ ٹکٹ کی قیمت زیادہ تھی۔ ٹکٹ پر قیمتیں بہت دھندلی روشنائی سے لکھی تھیں اور پڑھی نہیں جا رہی تھیں۔ اب یہ بزرگ خاتون مصر کے ہم ان کو بقایا رقم ادا کریں۔ اس پر یہ سکھ لڑکیاں ان پر غصّہ کرنے لگیں، ''یہ صاحبہ سارے راستے آپ کے بچوں کا خیال کرتی ہوئی آئی ہیں۔ آپ کے لئے ٹکٹ لے کر آئیں، اور اب آپ چند روپوں کے لئے اتنی خفگی دکھا رہی ہیں۔ آپ کے صاحبزادے خود دیکھ کر آئے تھے کہ وہاں کیا ہو رہا تھا۔ اُن سے تو ٹکٹ لئے نہ جا سکے۔ اب دفع کریں اس قصّے کو''۔ ہم نے بھی کہا کہ نیکی کر دریا میں ڈال، ہم نے انہیں اتنے پیسے پکڑا دیئے جو اُن کے خیال میں مناسب تھے۔ اِن صاحبہ نے برا سا منہ بنایا اور ہمیں کچھ روپے واپس کر دیئے۔ سکھ لڑکیوں نے پھر ہلّہ گلّہ شروع کر دیا اور صبح ۶ر بجے مرادآباد آنے تک جاری رکھا۔ یہ سب یہاں اتر گئیں۔ صبح ۷ر بجے رامپور آیا اور ہم یہاں اُتر گئے۔

رامپور میں اپنے بھانجے کی شادی علاوہ ہمارا دوسرا کام تھا مرتضٰی علی خاں کے بیٹے کے ولیمہ میں شرکت کا۔ جس دن ہمیں ولیمہ میں شرکت کی دعوت تھی، اسی دن ہمیں اپنے بھانجے کی دلہن کے انتخاب کے لئے کانپور جانا تھا۔ کچھ لڑکیاں کانپور میں رہتی تھیں اور ہماری ذمّہ داری تھی کہ ہم وہاں جا کر اُن لڑکیوں میں

سے اپنے بھانجے کے لئے ایک کوچنیں۔ ہمارا ویزا صرف رامپور کا تھا، لہذا ہم نے طے یہ کیا کہ کسی سے برقعہ لے کر پہنا جائے۔ ویسے تو رامپور میں ہم چادر پہنتے تھے لیکن کہا یہ جاتا تھا کہ چادریں صرف پاکستان کی عورتیں پہنتی ہیں اور اِس لئے چادر پہن کر جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ کانپور کے لئے پہلے رامپور سے لکھنؤ کی ٹرین لینا پڑتی تھی اور پھر وہاں سے کانپور ہم ٹیکسی یا تانگہ کر کے جا سکتے تھے۔ ٹرین کا وقت رات کے ۱۱ر بجے کا تھا اور ہمیں یہاں سے کانپور لے جانے کے لئے دلہن کے بھائی کوثر صاحب ساتھ چل رہے تھے۔ یہ رامپور ہی میں رہتے تھے۔

اب پہلے ولیمہ تھا اور نوابین کی محفل میں جانا اور بیچ میں سے اٹھ کر آ جانا مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ رامپور میں ہم نے مرتضیٰ علی خاں کی کوٹھی میں ولیمہ میں شرکت کی۔ بے حساب تحفہ تحائف دیئے گئے۔ ہم نے بھی اپنی طرف سے ایک تحفہ دیا، اور ساتھ ہی اپنا کہا ہوا کلامِ سہرا جو ہم نے فریم کروایا تھا، دوسرے تحفوں کے ساتھ رکھ دیا۔ یہ ایک نوابی ولیمہ تھا اور ہر چیز میں ابھی بھی رہی سہی نوابیت کی ہلکی سی جھلک تھی۔ ہر مہمان پر سکینہ خانم کی نظر تھی۔ یہ کام کرتی جا رہی تھیں اور ہم سے کہے جا رہی تھیں، ''آپ جائیں مت۔ ہم آپ کا کہا ہوا سہرا آپ کی زبان سے سنوانا چاہتے ہیں''۔ رات کے ۹ر بجے جوڑے بٹے اور اس کے بعد انہوں نے مراثن کو بلایا کہ وہ طبلہ لے کر آئے، اور ہم سے سہرا سنانے کی فرمائش ہوئی۔ ہم نے اس وقت تک یہ فریم کیا ہوا سہرا تحفتاً دوسرے تحفوں کے ساتھ رکھ دیا تھا اور یہ پتہ چلا کہ وہ تو مال خانہ میں جمع کرنے کے لئے دوسرے سامان کے ساتھ روانہ ہو چکا تھا۔ اب یہ فرمائش ہوئی کہ جتنا زبانی یاد ہو، ہم سنا دیں۔ ہم نے اپنی یادداشت کے سہارے انہیں چند اشعار سنائے اور وہ جھومتی رہیں۔ واہ واہ کرتی رہیں اور کہنے لگیں، ''آپ ضامنؔ صاحب کی شاگرد اور سالی ہیں، اُن کی یاد تازہ کر دی''۔ پھر ہمارے سامنے ایک نہایت قیمتی جوڑا رکھا اور بولیں، ''اگر یہ آپ کو پسند نہ آئے تو اُن دوسرے جوڑوں میں سے جو پسند آئے وہ لے لیں''۔ ہمارے دل میں خوف سوار تھا کہ رات کے ۱۱ر بجے کی ریل گاڑی سے ہمیں کانپور جانا تھا، کہیں ٹرین نکل نہ جائے، دوسرے اور زیادہ اہم یہ کہ ہم کسی کے چُنے ہوئے تحفے کے لئے ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کرتے۔ ہم نے وہی جوڑا لے لیا اور اُن کا شکریہ ادا کیا، کہا، ''اصل حیثیت آپ کے خلوص کی ہے۔ ہم وہی جوڑا لیں گے جو آپ نے ہمیں دیا ہے''۔ یہ کہہ کہ ہم نے اجازت لی اور اپنی ایک دوست بسم اللہ جہاں بیگم کو ساتھ لے کر نکل آئے۔ باہر آئے تو ہمارے دو بھانجے ہمارے منتظر تھے۔ سواری کا انتظام پہلے سے تھا۔ گھر پہنچے تو لڑکیوں کے بھائی کوثر صاحب ہمیں ساتھ

لے جانے کے لئے تیار تھے۔ ہم نے ولیمہ کا لباس تبدیل کر کے سفر کا لباس پہنا اور اوپر سے برقع پہنا۔ خاص باغ کے نزدیک ریلوے اسٹیشن پہنچے اور ٹکٹ خرید کر انتظار میں بیٹھ گئے۔ کوثر صاحب نے کہا، ''مراد آباد سے ٹرین بھری ہوئی آتی ہے۔ آپ کے سامنے جو ڈبّہ آئے چڑھ جایئے گا''۔ یہی ہوا۔ ٹرین آئی تو بھری ہوئی تھی۔ ایک ڈبّہ میں کوثر چڑھے اور ہم ایک مختلف ڈبّے میں۔ اِس میں اندھیرا گھپ تھا جو کہ ہندوستانی ٹرینوں میں انہونی بات نہ تھی۔ ہم نے بھی سرکتے ہوئے اپنی جگہ نکالی۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ یہ فرسٹ کلاس کا ڈبّہ تھا، سیکنڈ کلاس، یا تھرڈ کلاس کا۔ سارے ہی ڈبّے ایک جیسے اور سب ہی بھرے ہوئے تھے۔ گاڑی ایک منٹ کے لئے رکتی تھی اور ہم اس ایک منٹ میں سوار ہوئے تھے۔ آس پاس دیکھا تو کوثر صاحب نہیں نظر آئے۔ اندھیرے میں غور سے دیکھا تو یہ گاڑی کا آخری ڈبّہ تھا اور اس میں صرف مویشی تھے۔ ہم فرسٹ کلاس کا ٹکٹ ہاتھ میں پکڑے اس سے ناک کے قریب پنکھا جھلتے رہے۔ کافی پریشانی کا شکار تھے کہ اگر کوثر صاحب نہ چڑھ سکے تو کیا ہوگا۔ ہم کانپور تو پہنچ سکتے تھے لیکن اس کے آگے کا ہمیں پتہ نہیں تھا۔ یہ ٹیلیفون یا موبائیل فون کا زمانہ نہیں تھا۔ مویشیوں کے ڈبّے کا فائدہ یہ ہوا کہ ہم نے انہیں ہش کیا تو انہوں نے ہمیں جگہ دے دی۔ ساتھ ہی ایک صندوق رکھا تھا، ہم نے اس پر ایک کپڑا بچھایا اور سارے راستے اس پر بیٹھے۔ راستے کے ایک اسٹیشن پر اترے تو کوثر صاحب وہاں نظر آئے۔ انہوں نے بتایا کہ اُن کے ڈبے میں بالکل جگہ نہیں تھی۔ پھر بھی ہم وہیں گئے۔ لکھنؤ اترے تو دل چاہا کہ کچھ پرانے جاننے والوں سے ملیں۔ پچھلی مرتبہ آئے تھے تو گولہ گنج میں ٹھہرے تھے۔

اِسٹیشن پر ہاتھ منہ دھویا۔ صبح ہوگئی تھی۔ چائے پی اور کوثر صاحب نے مُژدہ سنایا کہ یہاں سے بَس یا تانگے میں چلنا ہوگا۔ ہم نے تانگے پر بیٹھنا پسند کیا کہ ذرا گھومتے پھرتے دیکھتے بھالتے چلیں کہ وقت کم تھا، کام بہت تھے۔ اُس وقت ہمارے والد، والدہ، بہن اور بہنوئی کا اِنتقال ہو چکا تھا اور ہم اس لئے آئے تھے کہ اِن بچوں کا گھر بَسا دیں تو ہماری بہن کے گھر کا راستہ کُھلا رہے۔ جب رامپور سے چلے تھے تو ہمیں بتایا گیا تھا کہ، ''کوثر صاحب کی کئی بہنیں ہیں، جن میں سے دو بن بیاہی ہیں اور بڑی گھر گرِہست ہیں۔ فیصلہ آپ پر ہے جو آپ کہیں گی، وہ حکم ہم بجالائیں گے''۔ بچوں کے اِس فیصلے سے ہماری ذمہِ داری بڑھ گئی۔ راستے بھر سوچتے رہے۔ اِسی لئے تانگے کو پسند کیا تھا کہ گھر تک آرام آرام سے لے جائے اور ہمیں سوچنے کا وقت مِلے۔

لکھنؤ اسٹیشن سے کانپور، تقریباً پچاس یا پچپن میل کا راستہ ہم نے تانگہ سے ساڑھے چار گھنٹے میں

طے کیا۔ کوثر صاحب کے گھر پہنچے، اِن لڑکیوں کی بڑی بہن نسیم سے مِلے۔ ظہر کے وقت تک چائے سے فارِغ ہوئے۔ اِتنی دیر میں دونوں بہنوں کو دیکھا۔ اب فیصلہ کیا کریں۔ اِن سے کہا کہ ہمیں نماز پڑھنا ہے۔ نسیم نے جگہ بتائی۔ ہم نے وضو کیا، نماز پڑھی اور دعا کی، ''یہ بچیاں اور میرے بھانجے بغیر والدین کے ہیں۔ یہ فیصلہ پوری زندگی پر مُحیط ہوگا۔ اب فیصلہ تیرے ہی اِختیار میں ہے، تو راستہ دِکھا''۔ دعا کے بعد ہم نے اِستخارہ کیا تو بڑی بہن کے نام آیا۔ ہم مُسکراتے ہوئے اُٹھے اور کوثر کو بلایا اور کہا، ''بھائی، اِستخارہ آپ کی بڑی بہن پر آیا ہے''۔ کوثر صاحب بہت خوش ہوئے کہ استخارہ چھوٹی بہن پر آتا تو نہ جانے لوگ کیا کیا سوچتے۔ اُسی روز رات کو، کوثر، بڑی بہن، بہنوئی، اور دو چار دوسرے لوگ جمع ہوئے، تاریخ مقرّر ہوئی۔ مہر طے ہوا، مہمانوں کی گنتی، وغیرہ وغیرہ۔ سب ہی کچھ چند گھنٹے میں طے ہوا۔ کیا نظام تھا، یہ طے کیا کہ شادی اس خاندان میں کرنا ہے۔ جس لڑکی کے نام استخارہ آیا، شادی طے ہوگئی۔

رات کے کھانے کے بعد لوڈو کا میچ شروع ہوگیا۔ ۲ر بجے تک محفل سجی رہی۔ دوسری صبح اُٹھ کے ناشتہ ہوا۔ کوثر کے بہنوئی دوپہر سے پہلے ہی دفتر سے آ گئے اور گفتگو شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ سرسی کے محلّہ دالان سے تھے۔ اس محلّہ والوں سے ہمارے والد کے برسوں کے تعلقات تھے۔ جب وہ لوگ ہمارے گھر آتے تو ہم پورا گھر اُن کے حوالے کر کے اپنی بہن کے گھر چلے جاتے تھے۔ انہی باتوں میں شام کے کھانے کے بعد تاش کا کھیل تُرپ چال (Trumps) شروع ہوگیا، ان شرطوں پر کہ ہارنے والا چائے بنائے گا۔ ہم نے یہ کھیل اور برج شادی کے بعد اپنے شوہر سے سیکھے تھے کیونکہ یہ کھیل فوجی افسروں کے میس میں ہوتا تھا۔

کانپور سے رامپور واپسی تیسرے روز ہوئی۔ کانپور کا جین مندر اور کملا ٹاور واپسی کے سفر میں راستے میں پڑے، سو وہی دیکھے۔ یہ صنعتی شہر ہے اور کافی گہما گہمی تھی، لیکن لکھنؤ کی طرح کی نہیں۔ رامپور پہنچے تو سب جمع ہوئے کہ پتہ کریں کہ خالہ جان کیا فیصلہ کر کے آئی ہیں۔ ہماری پسند سب کو پسند آئی۔ شادی کی زور شور سے تیاریاں شروع ہوگئیں۔ شادی کے دعوت نامے چھپے اور مہمانوں کی فہرست ہم نے اپنے ماموں سید علمدار حسین کاظمی سے بنوائی۔ انہوں نے یہ حکم بھی صادر کیا کہ ہماری باجی اور ہماری اپنی سسرال والوں کو زبانی دعوت دی جائیگی، صرف دعوت نامہ کافی نہیں، پھر یہ کہ یہ کام ہمارا تھا۔ ہماری سسرال امروہہ میں تھی اور باجی کی سسرال یہاں سے قریب سادات نوگاواں میں تھی۔ یہ بزرگانہ رسم ہم آج بھی نباہ رہے ہیں۔ ہم نے اپنے

سب سے چھوٹے بھانجے راشد کو ساتھ لیا اور امروہہ روانہ ہوئے۔

سفرِ امروہہ

فیصلہ یہ ہوا کہ امروہہ بس سے جائیں تا کہ آس پاس کا علاقہ بھی دیکھ سکیں۔ رکشہ لے کر بسوں کے اڈّہ پہنچے۔ سارے راستے لاہور کی طرح دھول اور دھوئیں سے بچنے کے لئے دوپٹے سے منہ ڈھکے رہے، گو کہ ویسے بھی برقعہ کی نقاب پڑی تھی۔ ہر بس پر ان کے راستی نمبر ہندی میں تھے۔ ہم اپنے بھانجے راشد صاحب سے پوچھتے رہے کہ یہ نمبر کیا اور بس کہاں جائیگی۔ ریل گاڑیوں میں ساری معلومات انگریزی اور ہندی دونوں میں ہوتی تھیں لہذا یہ دقّت پیش نہیں آئی تھی۔ مراد آباد تک ایک بس لی، اور وہاں سے امروہہ کی بس لی۔ مراد آباد سے چورن کی ایک شیشی لی۔ امروہہ اور نوگاواں کے کھانوں سے معدے میں جلن ہوتی تھی، اس چورن سے اس تکلیف میں بہت فائدہ ہوتا تھا۔ امروہہ کی بس میں بیٹھ کر اندازہ ہوا کہ یہ بہت بڑی غلطی کی تھی۔ ساری بس میں محنتی دیہاتی بھرے ہوئے تھے اور وہ بھی پسینہ سے بھرے ہوئے۔ فروری شروع ہو چکا تھا اور گرمی ابھی اتنی نہیں تھی لیکن یہ غریب لوگ نمعلوم کتنی دور سے اپنا سامان سر پر رکھ کر بس اسٹینڈ تک لائے ہوں گے۔ غرض ہم ایک کھڑکی کے برابر بیٹھے تھے مگر کھڑکی کھول نہیں سکتے تھے کہ ٹھنڈی ہوا آتی۔ لہذا عطر کی ایک شیشی سونگھ سونگھ کر گزارا کیا۔ اللہ سے معافی مانگ ہی رہ تھے کہ امروہہ آ گیا اور اِس طرح معافی کا سلسلہ منقطع ہوا۔

بسوں کے اڈّہ سے ایک رکشہ کیا۔ اس سے کہا کہ محلّہ گذری جانا ہے تو وہ پوچھنے لگا کہ کس کے گھر جانا ہے۔ ہمیں تشویش ہوئی کہ یہ کیا شجرہ پوچھنے بیٹھ گیا۔ جلدی میں ہمارے منہ میں جو بھی نام آیا وہ ہم نے کہہ دیا۔ دل میں چور تھا کہ ہمیں ہندوستانی سفارتخانے سے صرف اور صرف رامپور کا ویزا ملا تھا۔ یہ نام ہمارے شوہر ذاکر حسین کے چچازاد بھائی کا تھا۔ اب یہ رکشا چلا تو ہمیں اللہ سے معافی کا سلسلہ وہیں سے شروع کرنا پڑا جہاں منقطع ہوا تھا۔ گرد، شور اور ٹریفک، سب ہی لاجواب تھے۔ اس شخص نے ہمیں عین اُن کے گھر کے سامنے اتارا۔ ہم اتُرے اور اندر گئے تو دھوم مچ گئی کہ ''جگن کی دلہن'' آ گئی۔ رات تک سارے عزیز جمع ہو گئے۔ یہاں ہمارے شوہر کے سوتیلے بھائی بھی رہتے تھے جو کافی ملول ہوئے کہ ہمارے ہوتے ہوئے ہم ذاکر صاحب کے چچازاد بھائی کے گھر اترے۔ ہم نے ان کو رام کہانی سنائی تو معاملہ ٹھنڈا ہوا۔ دوسرے دن ہم ان کے گھر منتقل ہو گئے۔ ایک بار پھر گرما گرم ناراضگی اور معذرت کا دور چلا، اور پھر خاطر مدارات شروع ہو گئیں۔ ان

کی زمینیں اب اتنی نہیں رہی تھیں کیونکہ اکثر زمینیں ہندوستانی حکومت نے سوشلزم کے بہانے ہتھیا لی تھیں۔ یہاں خوب دیسی گھی اور مکھن کے پراٹھے گھر کے دودھ کی کھیر کے ساتھ کھلائے گئے۔نتیجہ یہ کہ ہم نے بھانجے راشد سے کہا،''بیٹا، اب اس چورن کی ضرورت ہے''۔ جہاں گئے، ایسی ہی خاطریں ہوئیں، اور چورن کام آتا رہا۔تیسرا دن آیا اور رات گئے ہم پرانی باتوں کو یاد کرتے رہے۔معلوم کیا کہ ہماری زمین کس کے پاس تھی، کون استعمال کر رہا تھا، وغیرہ وغیرہ۔آج ہم بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ زمین اپنوں کے پاس تھی۔انہوں نے کھایا یا ہم نے، دونوں غیر تو نہیں۔

چوتھے دن مزارِ دادا شاہ ولایت گئے۔ ہماری سسرال کے اِس آبائی قبرستان میں تمام اہم ہستیاں دفن ہیں۔مسلمان اور ہندو سب یہاں منّت ماننے آتے ہیں۔ایک غیر مسلم کی انتخابات جیتنے کی دعا پوری ہوئی تو انہوں نے قبرستان کے گرد چہار دیواری اور اندر آنے کی سڑک پختہ کروائی۔اندر چھوٹی دکانوں میں شیرینی، چادریں، اگربتی اور موم بتیاں مل جاتی ہیں۔شربت اور پھل کے ٹھیلے ہیں۔

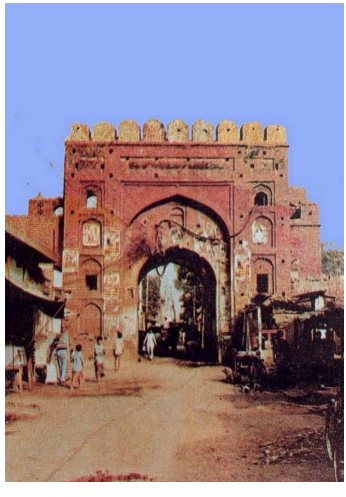

امروہہ: بی بی بخوئی کی قبر اور درخت ..... اور ..... مراد آبادی دروازہ

یہاں سے اندر آتے ہوئے اوپر چبوترے پر بی بی بخوئی کا مزار ہے اور اس کے سرہانے ایک درخت ہے جس کا پھل شکل اور مٹھاس میں الائچی دانے جیسا ہوتا ہے، اور حجم میں اس سے ذرا سا کم ہوتا ہے۔اصل الائچی دانہ چینی سے بنتا ہے۔لیکن اس پھل کی ایسی مٹھاس ایک معجزہ سمجھا جاتا ہے۔اس دانے کو

منّت کے طور پر کھاتے ہیں۔اس درخت کے پیچھے روایت یہ ہے کہ یہاں ساداتِ امروہہ کے بانی دادا شرف الدّین شاہ ولایت کی صاحبزادی بی بی بخوئی کے پیچھے ایک سپاہی پڑ گیا تھا اور یہ بھاگ رہی تھیں۔روایت ہے کہ انہوں نے دعا کی کہ زمین پھٹ جائے اور یہ اس میں سما جائیں۔یہی ہوا کہ زمین پھٹی، یہ اس میں سمائیں، اوران کے بالوں کی چوٹی زمین کے باہر رہ گئی۔ان کے بالوں کی چوٹی میں بندھا ہوا موباف باہر ہی رہ گیا۔ موباف کپڑے سے بنا ہوتا ہے جسے بالوں کو باندھنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔بالوں کی اس چوٹی سے یہ درخت نکلا تھا اور آج یہ درخت دیکھیں تو لگتا ہے کہ جیسے یہ کسی کے بال ہوں۔اب یہاں مرادیں مانی جاتی ہیں اور مراد آنے پر سات عدد مٹّی کی چھوٹی ہانڈیاں الائچی دانوں سے بھر کے چڑھائے جاتی ہیں۔

یہاں سے کچھ آگے دادا شاہ ولایت اوران کی زوجہ کے برابر برابر مزار ہیں۔یہاں لوگوں کا ہجوم تھا۔مزار کے پاس ایک حجرہ ہے جس میں بچھو بھرے پڑے ہیں لیکن یہ حجرے کے اندر کسی کو ڈنک نہیں مارتے۔ آپ انہیں یہاں سے باہر نکالیں تو فوراً کاٹ لیتے ہیں۔مزار کی رکھوالی ایک مجاور کے ذمّہ ہے۔

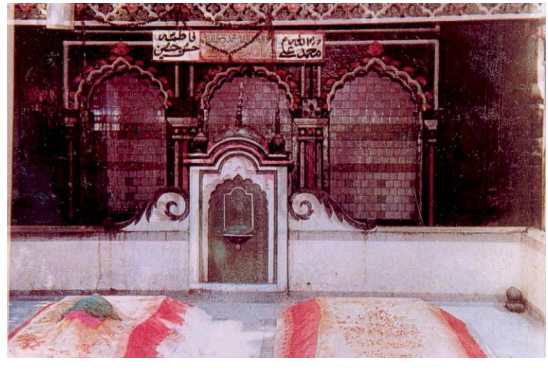

امروہہ: حجرہ شاہ ولایت، چھوٹے دریچے پر بچھوؤں کی دم ..... اور ..... بچّھو جو مزار کے اندر ڈنک نہیں مارتے

ہم نے مجاور سے یہ بچّھو دکھانے کو کہا تو انہوں نے مٹّی کے ایک بدھنے میں ہاتھ ڈال کر مُٹھی بھر بچّھو نکال لئے۔بدھنا مسجد کے لوٹے کی طرح کا ہوتا ہے۔انہوں نے ہم سے ہمارے بارے میں پوچھا، اور ہمارے بتانے پر کہ ''ہم اُسی خاندان کی بہو ہیں''، انہوں نے بچھو ہمارے ہاتھ میں رکھ دیئے۔ہم نے بھی مجبوراً لے لئے کہ خود کو شاہ ولایت کی بہو ظاہر کر چکے تھے۔خدا کا شکر ہے کہ کسی نے ہمیں نہیں کاٹا۔کچھ زمین پر گرے تو مجاور نے انہیں اٹھا کر دوبارہ بدھنے میں رکھ لئے۔ہم نے اپنے بھانجے سے کہا، ''تم بھی لو''۔ان کا

تو منہ پہلے ہی سفید ہو رہا تھا۔ ہم کو دیکھتے ہوئے کہنے لگے، ''لائیے خالہ جان، دیکھا جائے گا''۔ انہوں نے بھی ہاتھ پر رکھے، اور پھر ہم دونوں نے یہ بچّھو دوبارہ بدھنے میں ڈال دیئے۔ ان بچّھوؤں کو مزار سے باہر لے کر جانا ہو تو اجازت لینا ہوتی ہے۔ اب اس کے بعد اگر آپ اپنے وعدے کے مطابق مقرّرہ وقت تک واپس لے آئیں تو یہ بچّھو نہیں ڈنک مارتے۔ وعدہ خلافی پر جسمانی نقصان کا احتمال ہوتا ہے۔ غرض ہم نے فاتحہ پڑھی اور ایک چھوٹی سی دعا مانگی۔ پانچ دن بعد رامپور واپس پہنچے تو دعا پوری ہو چکی تھی۔

ہمارا امروہہ میں آنے کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ اب نوگاواں کے خاندان باقی رہ گئے تھے۔ سو ہم نوگاواں کی طرف روانہ ہوئے۔

سفرِ نوگاواں

اس علاقے میں ایک سواری تھی جس کا نام تھا ٹیمپو۔ یہ تین پہیّوں کی موٹر رکشا نما گاڑی ہوتی تھی اور اس میں آٹھ یا دس مسافر سوار ہو سکتے تھے۔ اسی سواری سے نوگاواں چلے۔ کل ۸/مسافر تھے۔ چھوٹے انجن کی اس گاڑی کا شور اور دھواں سارے راستے تنگ کرتا رہا۔ اس سفر سے پیشتر بھی نوگاواں میں آ چکے تھے۔ ایک بار اپنی شادی سے پہلے ایک بیل گاڑی میں، اور دوسری بار ایک شادی کے سلسلے میں ایک لاری بس پر۔ یہ ٹمپو کا سفر اپنی نوعیت کا پہلا تھا۔

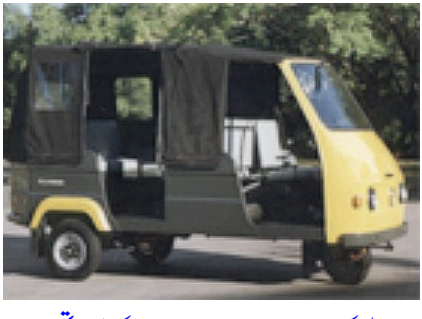

ٹمپو کی یہ سواری جو لاہور کے موٹر رکشا کی طرح تھی

یہاں نوگاواں میں ہمارے ایک عزیز مختار بھائی مرادآباد کے اسٹیشن پر اسٹیشن ماسٹر تھے۔ انہوں نے سنا کہ ہم آئے ہوئے ہیں تو دفتر کسی اور کے حوالے کر کے فوراً پہنچ گئے۔ آتے ہی اپنی بیگم سے کڑھی، چاول، کوفتہ اور دوسری کئی چیزیں تیار کروائیں۔ یہ کھانا لکڑیوں کے اوپر پکا تھا۔ گھر کے صحن میں ایک بڑا سا درخت تھا، اس کے نیچے ایک میز بچھا کر اس پر کھانا چنا گیا۔ ہم نے دیکھ کر حیرانگی کا اظہار کیا، ''بھابھی، لکڑی کے چولہے پر کھانا پکتا تو جلد ہی ہے، لیکن آپ نے تو ہتھیلی پر سرسوں جما دی''۔ وہ بولیں، ''آپ اتنے عرصے بعد آئی ہیں، کھانا پکانے میں مزا

آ رہا تھا‘‘۔ ان کے بچّوں کو دیکھا، سب نے ماشاء اللہ سے لمبے چوڑے قد نکال لئے تھے کہ ۲۲ ؍ سال بہت ہوتے تھے۔ اسی اثناء میں ایک پڑوسن آئیں اور شادی کے بارے میں پوچھتی رہیں اور پھر فوراً معذرت کر کے چلی گئیں۔ جب یہ گئیں تو مختار بھائی نے کہا، ’’یہ بی جمالو ٹائپ کی ہیں، ان کا پیٹ پھول رہا تھا۔ اب یہ ہر محلّہ میں جا کر خبر کریں گی‘‘۔

یہاں سے فارغ ہوئے تو ابھی دس بارہ گھر باقی تھے۔ ہر گھر میں جا کر بلاوہ دیا اور ہر ایک نے زبردستی کچھ نہ کچھ کھلایا۔ ہم بھی ہر ایک کا دل رکھتے رہے اور چورن کی شیشیاں خالی ہوتی رہیں۔ شام تک ہم امروہہ اپنے جیٹھ کی حویلی میں واپس پہنچ گئے۔ یہاں پہنچے تو سارے بچّے چمٹ گئے، کہنے لگے کہ اتنے دنوں بعد آئی ہیں تو آپ کو فلم دکھا لائیں۔ ہم نے حیران ہو کر پوچھا، ’’یہاں بھی سنیما بن گیا ہے‘‘۔ ایک نے فخر سے کہا، ’’اب امروہہ ضلع مراد آباد کا حصّہ نہیں رہا۔ یہ خود ایک ضلع ہے۔ کہاں آپ پہلی مرتبہ بیل گاڑی میں آئی تھیں، اب یہاں موٹر رکشا اور ٹیمپو ہیں اور سڑکیں بن گئی ہیں۔ ہم تو سنیما کے ٹکٹ بھی لے آئے ہیں، اب تو چلنا ہی پڑے گا‘‘۔ غرض ۶ ؍ عدد سائیکل رکشا بلائے گئے، اور ہر ایک پر دو عدد بچے گن گن کر بٹھائے گئے۔ رکشا والے نے پوچھا، ’’کون سے منڈوے چلنا ہے‘‘۔ یہ منڈوہ کیا؟ پنجابی کا منڈا تو سنا تھا۔ پتہ چلا کہ منڈوہ سنیما ہال کو پکارتے ہیں۔ سردیوں کے چھوٹے دن تھے اور اندھیرا جلدی ہو گیا تھا۔ راستے میں بجلی کے کھمبے تو تھے، لیکن روشنی نہیں تھی۔ پتہ چلا کہ بجلی تو ہے، لیکن زیادہ تر کھیتوں میں پمپ چلانے کے لئے۔ گھروں میں بجلی بس دو یا تین گھنٹوں کے لئے آتی تھی۔ منڈوے پہنچے تو وہاں بھی اندھیرا تھا۔ ایک صاحب ٹارچ سنبھالے ہوئے آئے، اور کہنے لگے کہ زنانہ اوپر ہے، مردانہ نیچے۔ ہم نے کہا، ’’بھائی صاحب، ہم سب ایک ہی گھر کے لوگ ہیں، ساتھ بیٹھیں گے‘‘۔ انہوں نے ہم سب کو ہی اوپر بھیج دیا۔ اب ہم انتظار کرتے رہے کہ بجلی آئے تو فلم شروع ہو۔ اب فلم شروع ہوئی تو یہ ہم نے پہلے ہی اپنے گھر میں وی سی آر پر دیکھی ہوئی تھی۔ بہرحال فلم دیکھ کر گھر واپس پہنچے اور چوروں اور چوریوں کے قصّے شروع ہو گئے۔ یہاں کھٹمل بہت ہوتے تھے۔ ہم نے پوچھا، ’’یہاں کھٹمل ابھی بھی ہوتے ہیں؟‘‘ جواب ملا، ’’وہ کہاں جائیں گے، ہم ہی عادی ہو گئے ہیں ان کے۔ اب تو یہ ماشاء اللہ ۲۲ ؍ برس کے ہو گئے ہیں‘‘۔ ساری رات کھٹملوں سے بچتے رہے اور نیند نہیں آسکی۔ ہم حیران تھے کہ یہ لوگ یہاں کس طرح سوتے ہونگے۔ اسی دفاع کے دوران کیڑے مکوڑوں پر بات چلی تو ہم نے ایک بزرگ خاتون سے امروہہ کے ان بچھوؤں کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے ہمیں یہ روایت سنائی۔

روایت ۔ امروہہ کے بچھو اور روایت دادا شاہ ولایت

جب دادا شاہ ولایت امروہہ پہنچے تو یہاں ایک بزرگ پہلے سے اِسلام پھیلا رہے تھے۔ انہوں نے ایک مرید کے ہاتھ دادا صاحب کو پانی کا کٹورہ بھیجا۔ مقصد یہ تھا کہ دادا صاحب یہ پانی پی لیں تو وہ اُن بزرگ کے مرید یا رتبہ میں کم ہو جائیں۔ دادا صاحب نے اس میں گلاب کا پھول ڈال کر واپس کر دیا۔ اِس کا مقصد یہ تھا کہ ''ہمیں برابری اور دوستی پسند ہے، لیکن مریدگی کا خیال ذہن سے نکالنا ہوگا''۔ ان بزرگ کو یہ ناپسند رہا کہ دادا صاحب نے یہ پانی پیا نہیں۔ اب اس پر ان دونوں میں اس قدر بحث چھڑی کہ بزرگ نے دادا صاحب کو بد دعا دی کہ دادا صاحب کی قبر پر بچھو ہوں۔ دادا صاحب نے کہا، ''ہونگے تو، مگر کاٹیں گے نہیں۔ اور تمہاری قبر پر تمام شہر کے کھوئے ہوئے گدھے ملیں گے''۔ اب یہی ہے کہ تمام کھوئے ہوئے گدھے ان بزرگ کی قبر پر ملتے ہیں۔ یہ تو تھی کہانی ان کی زبانی، آگے اللہ زیادہ واقفیت رکھتا ہے۔ ہم اسی طرح کے واقعات سنتے سناتے پانچ دن بعد رامپور واپس آ گئے۔ امروہہ میں ہم ایک بار بھی اپنے شوہر کے حصہ کی زمین دیکھنے نہیں گئے۔

ایک واقعۃ الشادی

اس شادی میں ہمیں اندازہ ہوا کہ ہم گذشتہ ۳۰ر سالوں میں رامپور سے کتنی دور آ چکے تھے۔ پاکستان میں شادیاں اب شادی گھروں میں ہوتی تھیں اور ان میں موسیقی کے خاص ساز و سامان اور کھانے میں ایک اور ہی انتظام ہوتا تھا۔ قرینہ اور تہذیب مختلف تھی۔ رامپور میں گھر بڑے بڑے تھے اور شادیاں گھروں میں ہوتی تھیں۔ زیادہ ڈھول ڈھماکہ نہیں ہوتا تھا۔ علماء تنبیہ کرتے تھے کہ اگر بے جا اصراف ہوئے یا موسیقی ہوئی تو وہ نکاح نہیں پڑھائیں گے۔ پاکستان میں مولانا کا کام صرف نکاح پڑھانا تھا۔ نکاح پڑھائیں اور چلے جائیں، اور اگر موسیقی پسند نہیں تو اور ہی جلدی شادی گھر چھوڑ دیں۔

یہاں رامپور میں امروہہ اور نوگاواں والے مہمان شادی سے ایک ہفتہ پہلے آ گئے تھے۔ شادی کے ایک دن پہلے رت جگا ہوا، اور رنگ کھیلا گیا، جیسے کہ ہندوانی ہولی میں کھیلا جاتا تھا۔ یہ نئی چیز تھی، اور غالباً ہندوستان کا اثر تھا۔ ہمارے ماموں علمدار کاظمی بھات لے کر آئے۔ بھات میں سب خصوصی شرکاء کے لئے

جوڑے، مٹھائی، پھل، میوہ اور حسبِ توفیق زیور، ایک بڑے تھال یا تھالوں میں آتا ہے۔ ہمارے بھانجے زاہد، دولہا میاں، ریڈیو انجینئر ہیں اور اس وقت رنگین ٹیلی ویژن کے بارے میں پڑھ رہے تھے۔ یہ شئے رامپور میں بھی آچکی تھی۔ یہ جس فیکٹری میں کام کرتے تھے وہاں کا سارا عملہ ہندو اور منیجر عیسائی تھا۔ بارات میں آدھے راستے سے اِن کے دوستوں نے بھنگڑا شروع کر دیا۔ دلہن کی طرف سے نواب کی بڑی بیوی بیگم رفعت زمانی شریک ہوئیں۔ نواب رامپور رضا علی خاں کی وفات کے بعد انہیں راج ماتا کا خطاب دیا گیا تھا۔ نکاح اور کھجوروں کے بعد ڈبّوں میں بالوشاہیاں تقسیم ہوئیں۔ اس کے بعد رخصتی کی جلدی ہوئی کہ بجلی نہ چلی جائے۔ اب ہم باراتی جلدی جلدی اپنے گھر کی طرف چلے۔

رامپور: دولہا اور مولانا۔ یہ سادگی کی شادیاں اب رامپور میں بھی نہیں ملتیں۔

بارات کے گھر آتے آتے بجلی جا چکی تھی۔ ساری رات گیس کے ہنڈے جلے اور لکڑی جلانے والے چولہوں پر کھانا پکا کہ دوسرے دن ولیمہ تھا۔ صبح ۸ر بجے سے ولیمہ کا کھانا شروع ہوگیا جو پاکستان میں ہمیشہ رات کو ہوتا تھا۔ یہاں لوگ آتے، سلامی دیتے اور کھانا کھا کے جاتے رہے۔ صبح ۱۰ر بجے سے شام ۵ر بجے تک یہ سلسلہ چلا۔ ہندوؤں کے لئے الگ باورچی اور الگ کھانے تھے کہ یہ لوگ گوشت نہیں کھاتے تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں وہی پرانی والی یگانگت دیکھی۔ اب اللہ جانتا ہے کہ یہ ضرورتاً تھی یا دِل صاف تھے۔

ہم نے دلہن کے لئے سولہ کلیوں والا پاجامہ سیا تھا اور اس کے ساتھ کی ویسی ہی اوڑھنی تھی۔ نواب بیگم یہاں بھی آئی تھیں۔ ہم ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ ہمارے بہنوئی ضامنؔ صاحب کا ذکر رہا جو دولہا کے والد بھی تھے اور نواب کے خاص مصاحبین میں سے تھے۔ ہم نے نواب کی بیگم کو ضامنؔ صاحب کا

کلام سنایا۔ یہ رُخصت ہوئیں تو ہم سب شام کو چوتھی کی رسم میں شرکت کے لئے دلہن کے گھر گئے۔ یہ رسم بھی بہت مختصر ہوگئی تھی۔ اب بچے جوتا چرائی میں دولہا کا جوتا چرا کر لے گئے۔ رسم کے مطابق زاہد دولہا میاں نے بچوں کو پیسے دیئے ہی تھے کہ بجلی چلی گئی اور پتہ نہیں چلا کہ جوتا گیا کہاں، پیسے بھی گئے۔ انہیں ایک دوست نے اپنا جوتا دیا جو غالباً دولہا پر برے وقتوں کے لئے ساتھ رکھا گیا تھا۔ اسی اندھیرے میں ہم سب واپس آ رہے تھے کہ ایک مہمان کے رکشہ ڈرائیور پر ایک گلی کے کتّے نے حملہ کر دیا اور وہ غریب ایسا بوکھلایا کہ اسی اندھیرے میں اس کا رکشا سڑک کے کسی گڑھے میں پھنس کر الٹ گیا۔ ہم پر ہیبت سوار کہ مہمانوں کو چوٹ تو نہیں آئی، اور ہم سب سے پوچھنے لگے، ''ارے کوئی ٹوٹ پھوٹ تو نہیں ہوئی''۔ اب دلہن سمیت سب لڑکیاں منہ میں دوپٹہ ڈال کر ہنسیں۔ بعد میں اندازہ ہوا کہ رامپور میں ابھی بھی لوگ چوٹ کے بارے میں یہی کہتے تھے کہ ''کوئی چوٹ ووٹ تو نہیں آئی''، جب کہ ہم کراچی کی بولی بول رہے تھے کہ ''ٹوٹ پھوٹ تو نہیں ہوئی''۔ اب اِس کے بعد دوسری رسم اور چالے شروع ہوئے کہ ہمیں جلد ہی پاکستان واپس جانا تھا۔ پہلی دعوت دلہن کے بھائی کوثر کے گھر ۲/ مارچ ۱۹۸۱ء کو ہوئی۔

یہاں کھانا شروع ہوا ہی تھا کہ خبر ملی کہ پاکستان کا کوئی جہاز اغوا ہوگیا۔ پتہ چلا کہ جنرل ضیاء الحق کے خلاف بنائی جانے والی الذوالفقار تنظیم کے سلطان ٹیپو اور دو دوسرے نوجوان لڑکوں نے یہ جہاز اغوا کر کے کابل پہنچا دیا تھا اور ایک حکومتی افسر کو گولی سے قتل بھی کر دیا تھا۔ ہمارے ہاتھ سے کھانے کا نوالہ چھوٹ گیا۔ شمس اس وقت پی آئی اے میں تھے اور ہمارا خیال تھا کہ وہ اسی پرواز پر تھے۔ ہم نے گھر تار دیا کہ ہم آ رہے ہیں اور یوں شادی کے چھٹے دن رامپور سے روانہ ہوئے۔ سب اداس تھے کہ ہم اتنی جلدی واپس جا رہے تھے گو ویزا ابھی باقی تھا۔ ۱۵/ مارچ ۱۹۸۱ء کو ہم نے امرتسر سے پاکستان کے لئے آخری بار سرحد پار کی، اور لاہور سے ہوائی جہاز پر کراچی آئے۔ ایئرپورٹ پر لینے کوئی نہیں آیا تھا لہذا ہم نے ٹیکسی کی اور گھر پہنچے۔ اس سے ایک دن پہلے، ۱۴/ مارچ کو پاکستان کی حکومت نے پیوپلز پارٹی کے ۵۴/ سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا تھا جس کے بعد سلطان ٹیپو اور اس کے ساتھیوں نے دمشق کے ایئرپورٹ پر پی آئی اے کا یہ طیارہ چھوڑ دیا تھا۔ گھر پہنچے تو پتہ چلا کہ شمس اس پرواز پر نہیں تھے۔

ہمارے گھر پہنچنے کے ایک ہفتہ بعد ڈاکیہ نے ہمارے گھر کی گھنٹی بجائی۔ ہم باہر گئے تو ڈاکیہ صاحب

نے مسکراتے ہوئے ہمیں ایک تار دیا۔ یہ تار خوشی کے پیغام کا تھا، کہنے لگے، ''یہ دیکھیئے، آپ کی کوئی عزیز کراچی آ رہی ہیں''۔ ہم نے تار کا پیغام پڑھا۔ یہ ہمارا ہی بھیجا ہوا تار تھا جو ڈاک کے نظام کی اعلیٰ کارکردگی کی بناء ہمارے کراچی پہنچنے کے ٹھیک ایک ہفتہ بعد ہمیں مل گیا۔ اب خبر نہیں کہ دیر ہندوستان میں ہوئی تھی یا پاکستان میں۔ ہم نے اعلیٰ حضرت ڈاکیئے صاحب کا شکریہ ادا کیا اور انہیں آٹھ آنے دے کر فارغ کیا۔

اب اس بات کو ۲۰ رسال ہو چلے ہیں۔ وہ دن ہے اور آج کا دِن۔ ہم اس کے بعد ہندوستان نہیں گئے۔ شمس پی آئی اے کے کسی کام سے ۱۹۷۹ء ایک بار دہلی گئے تھے تو انہوں نے بھی رامپور میں ایک دن گزارا تھا۔ وہاں بہت کم ایسی ہستیاں بچی ہیں جو ہمیں پہچانتی ہوں۔ اب ہمیں تو رامپور، امروہہ، مرادآباد، سرسی، مِلک، لکھنؤ اور دہلی، یہ سب ایک دورِ گذشتہ لگتا ہے۔ اسی طرح شاید ہمارے اجداد ایران اور عرب سے ہندوستان آئے تو اُن ممالک سے ان کا رابطہ بالکل ختم ہوگیا۔ اب ہم ۱۲ رسال سے امریکہ میں ہیں اور پاکستان میں ہمارے جاننے والے آہستہ آہستہ ہمیں بھولتے جائیں گے۔ اس طرح ہماری اپنی زندگی میں یہ دوسری ہجرت مکمل ہو جائے گی۔

اٹھائیسواں سفر ۔ ملتان

لوگ دشمنوں کو پہچان لیں تو آپس میں نہ لڑیں۔ اپنے ہی دشمن ہوں تو معافی ہی ایک راستہ ہے جو سب کو ملائے رکھ سکتا ہے۔ ایک سیلاب کراچی کی بارش سے ۱۹۵۸ء میں آیا تھا جس میں ہم نے انسانوں کو تنکوں کی طرح بہتے دیکھا تھا۔ لاشیں مسجدوں میں جمع ہو جاتیں اور وارث اپنے عزیزوں کی خراب ہوئی لاشیں پہچان کر لے جاتے۔ اب ۱۹۸۲ء میں جو سیلاب آیا وہ کسی دوسری طرح کا تھا۔ تمام پاکستان کا غصّہ کراچی، اور خاص طور پر کراچی کے مہاجروں پر اُترا۔ اِس سے ہر ماہ سینکڑوں کی تعداد میں لوگ مرنے لگے۔ لاشیں ایدھی فاؤنڈیشن کے دفاتر اور کلینک میں جمع ہو جاتیں اور وارث اپنے عزیزوں کی خراب شدہ لاشیں پہچان کر لے جاتے۔ یہ لاشیں پانی سے خراب نہیں ہوتی تھیں بلکہ زبردست اور دہشتناک مار سے ہوتی تھیں کہ منہ اور سر کی ہڈیوں کے ٹکڑے پٹیّوں اور ٹیپ سے جوڑ کے لاشیں ان وارثوں کو دی جاتی تھیں۔

ہر گلی ایک مورچہ بن چکا تھا۔ ہر رات حملہ کا خدشہ ہوتا۔ کبھی پولیس بھی چوروں اور ڈاکوؤں کے بھیس میں آتی اور کئی پولیس والے اس طرح پکڑے گئے۔ حد یہ ہوئی کہ ہر محلّہ اور ہر گلی میں لوہے کے دروازے لگ گئے کہ گلی کہ اندر اِس گلی کے باسیوں کے علاوہ اور کوئی نہیں آ سکتا تھا۔ افغانی مہاجرین میں سے کچھ لوگ یہاں چوکیدار کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ افسوس کی بات تھی کہ جہاں کراچی میں یہ طوفان تھا، وہاں سندھ کے اندرونی حصّوں میں سندھیوں کو ڈاکو ہونے کے الزام میں پکڑنے کے بجائے گولی سے اڑا دیا جاتا۔ سندھ کے علاوہ ہر جگہ امن رہا، اور ترقی ہوتی رہی۔ شادی میں جائیں تو بغیر زیور کے جائیں، اور شام

ہونے سے پہلے پہلے شادی ختم کر کے گھر واپس آ جائیں۔

ان ہی تمام باتوں کے پیشِ نظر، اگست ۱۹۸۱ء میں شمس نے پی آئی اے سے چھٹی لے کر امریکہ کا رخ کیا اور بالآخر ۱۹۸۴ء میں سان فرانسسکو میں رہائش اختیار کی اور وہاں جگہ بدلنے کے ساتھ ساتھ زمانے کا ساتھ دینے کے لئے انہوں نے اپنی ایئر واسپیس انجینئرنگ کو خیر باد کہہ کر کمپیوٹرز کی طرف رجوع کیا۔ مارچ ۱۹۸۴ء میں ہمارے چوتھے صاحبزادے اعزاز بھی ڈاکٹری کا امتحان پاس کر کے سان فرانسسکو چلے گئے۔ ہماری بڑی بیٹی رعنا ایم اے اکنامکس میں کراچی یونیورسٹی سے اس سال، سوائے ایک طالب علم کے، باقی تمام طالب علموں سے زیادہ نمبر لے کر کامیاب ہوئیں۔ انہیں اس پر یونیورسٹی سے تمغہ ملا اور الائیڈ بنک میں ملازمت ملی۔ یہاں آتے ہی انہوں نے پاکستان بینکنگ کونسل کے دو امتحان دیئے اور اس میں بھی سب سے زیادہ اچھا نتیجہ دکھا کر بنک سے انعام لئے۔ لیکن جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں بنک کے کراچی کے دفتروں میں سندھ سے باہر کے باشندے لائے جانے لگے، اور سندھ اور خاص طور پر کراچی والوں کو ایسی جگہ بھیجا جانے لگا کہ وہ بنک کی ملازمت ہی چھوڑ دیں۔ رعنا کے دفتر میں ایک مولانا صاحب بنک کے وائس پریذیڈنٹ ہو گئے اور انہیں عورتوں کا دفتروں میں کام کرنا کفر نظر آنے لگا۔ اُنہوں نے یہ چال چلی کہ تمام لڑکیوں کے دور دراز کے دفتروں میں تبادلہ کرنے لگے تاکہ وہ گھبرا کر ملازمت ہی چھوڑ دیں۔ رعنا کو اسی سلسلے میں ملتان کے ایک بالکل ہی دیہاتی دفتر میں بھیج دیا گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ نئی انتظامیہ اس امید میں تھی کہ یہ لڑکی ہونے کی وجہ سے ملتان نہیں جائیں گی تو ان کی جگہ کسی مرد کے لئے خالی ہو جائیگی۔ لیکن انہیں یہ پتہ نہیں تھا کہ ملتان میں ہماری منہ بولی بیٹی تسنیم رہتی تھیں۔ اس وجہ سے حالانکہ ملتان جانا ہم سب کو بالکل ناپسند تھا، لیکن پھر بھی ہم سب انہیں وہاں بھیجنے کے لئے تیار ہو گئے۔ پھر ہمارے بڑے لڑکے نجم کی ملازمت بھی اس وقت اسی علاقے میں تھی جس سے کچھ آسانی کی امید تھی۔ خدا کا شکر تھا کہ بیٹی رعنا کے کراچی والے افسر کچھ عرصے بعد خود ہی روانہ کر دیئے گئے اور تمام لڑکیاں جن کا تبادلہ کر دیا گیا تھا، کراچی واپس بلا لی گئیں۔

رعنا کے ملتان جانے کے کچھ ہی عرصہ بعد ہمیں اپنی منہ بولی بیٹی تسنیم کی بڑی بیٹی کی شادی پر ملتان جانا پڑا۔ یہ گرمی کے دن تھے اور ہم نہیں چاہتے تھے کہ ہم جائیں۔ لیکن ہم نے انہیں ۱۶ سال کی عمر تک پالا تھا اور اب اس شادی کے لئے بلاوے پر بلاوے آ رہے تھے۔ دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ ہم بھی وہاں پہنچے۔

ان کا دومنزلہ گھر تھا۔ اوپر گرمی کے مارے سخت پریشانی ہوتی تھی۔ ہم نے اس لئے نیچے کے کمرے میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ بارات کے لئے انہوں نے ایک اور گھر رکھا تھا اور وہ بھی دومنزلہ تھا۔ تسنیم کے برابر برابر کئی گھر تھے۔ بہت دھوم کا بھات دیا گیا تھا۔ بھات میں جوڑے، برتن، نقدی وغیرہ بہت کچھ ہی ہوتا ہے۔ شام کو بینڈ باجے کے ساتھ بارات آئی۔ نفیریاں، ڈھول، اور پائپ وغیرہ بجاتے ہوئے لال وردیوں میں یہ بینڈ والے آگے آگے، اور پیچھے دولہا صاحب ایک کار میں آئے۔ علاقے کی گلیاں پتلی سی تھیں جن سے کار گزارنا ذرا مشکل تھا۔ کار پھولوں سے سجی ہوئی تھی۔ مشکل سے گلی میں پھنستی ہوئی گھر کے سامنے پہنچی تو دروازہ کھولنا مشکل۔ دولہا کار سے باہر آئے تو اِن کی شیروانی کار کے دروازے میں الجھ رہی تھی۔ لہذا دولہا کو نکالنے کے بعد فیصلہ ہوا کہ کار کو گلی کے باہر بڑی سڑک پر رکھا جائے اور دلہن کو وہاں تک پیدل لے جایا جائے۔ اس تمام وقت شادی کا بینڈ زور زور سے موسیقی سے نوازتا رہا اور کچھ شرکاء کے دل دہلاتا رہا۔ ایسے بینڈ تو ہندوستان میں ہوتے تھے۔ ہم پاکستان میں اب اتنے عرصے میں مختلف بینڈ کے عادی ہو چکے تھے۔ خاص طور پر کراچی میں تو اب گٹار اور الیکٹرک آرگن والے بینڈ آ گئے تھے، اور موسیقی میں دُھنیں ہلکی ہونے لگی تھیں۔ غرض اسی دلربا بینڈ کی موسیقی کے ساتھ دلہن گلی میں چل کر بڑی سڑک تک پہنچیں اور پھر اس لمبی چوڑی کار میں رخصت ہوئیں۔ چوتھی کی رسم چار دن بعد کی طے ہوئی۔

ملتان کی گرمی سے بچنے کے لئے ہم نے کوشش کی کہ ہم یہاں سے چلیں، لیکن سب بضد تھے کہ چوتھی میں شرکت ضرور کریں۔ ہم اس پر راضی ہو گئے، اور سوچا کہ کچھ سیاحت کی جائے۔ تسنیم کے شوہر نے اپنی بہن کو ساتھ کیا۔ ہم نے ایک آٹو رکشا لیا اور چلے۔ گرمیوں کی ہوا لو کے تھپیڑے لگا رہی تھی۔ پہلے یہاں کے بازار دیکھے۔ ہماری ساتھی ہمیں تیزی سے ان سب کے نام بتائے جا رہی تھیں، لیکن رکشا کے شور اور گرمی نے ہماری سماعت ماؤف کر دی تھی اور ہمیں کچھ بھی نہیں سنائی دیا۔ اہم جگہوں میں شاہ رکن عالم دیکھا۔ لال اینٹوں کی یہ خوبصورت عمارت چودھویں صدی میں غیاث الدّین تغلق نے اپنے مقبرے کے لئے بنوائی تھی لیکن بعد میں اس جگہ شیخ رکن عالم دفن کئے گئے۔ اس کے نیلے رنگ کے کام کی خوبصورتی بے مثال ہے۔

یہاں سے چل کر ہم محمد یوسف گردیزی کے مزار پر مقامِ قدم مولا علیؑ دیکھنے گئے جہاں روایت کے مطابق حضرت علیؑ کے پیر کا نشان ہے۔ مسجد علیؑ بھی گئے جو عالمگیر بادشاہ کے زمانے میں ۱۷۵۷ء میں

نواب علی منور خان خاکوانی نے بنوائی تھی۔ اس پر بھی نیلے ٹائل کا کام اپنی خوبصورتی کی مثال ہے۔ اس کے علاوہ ہم نے سن مندر اور دوسری مسجدیں اور مزار دیکھے جن کی ملتان میں کثرت ہے کہ یہ تقریباً ۲۰۰۰ ر ہزار سال پرانا شہر ہے جس پر سکندرِ اعظم سے لے کر محمد بن قاسم تک، اور مغلوں سے لے کر انگریزوں تک، بے شمار تاریخی فاتح شخصیتوں نے حکمرانی کی۔ ہم نے نشتر میڈیکل کالج بھی دیکھا اور اس کے بعد چوک بازار آئے۔ یہاں ہماری ساتھی بولیں، ''چلیں کچھ شاپنگ کریں''۔ ہم یہاں خریداری کے ارادے سے تو نہیں آئے تھے لیکن ملتان میں کڑھائی کا کام کی ہوئی بہت اچھی اشیاء ملتی ہیں۔ ملتانی کمبل، سوزنیاں، لکڑی پر باریک کام، باریک کام کے کڑھے ہوئے دوپٹہ، مرتبان اور باریک کام کے جال دار مسہری کے ڈڈے یعنی تکئے اور سرھانے۔ ہم نے تھوڑی سی خریداری کی اور گھر واپس آئے۔

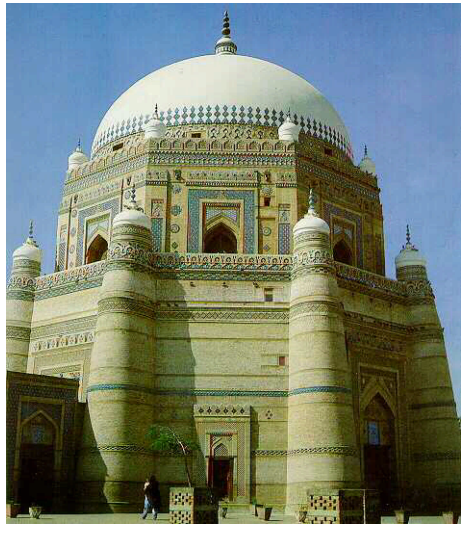

ملتان: مقبرہ شیخ رکنِ عالم

گھر پہنچتے ہی ہمیں پھر کراچی جانے کی لگی۔ سارے ہی گھر والے ملتان نہیں آ سکے تھے۔ ہمارے جیٹھ کے دوسرے صاحبزادے اور اُن کی بیوی اور بچوں کے ریلوے ٹکٹ ہمارے ساتھ ہی تھے۔ ہم نے بالآخر طے کر لیا کہ ہم ٹکٹ اور نشست منسوخ نہیں کروائیں کیونکہ ملتان سے نشستیں دوبارہ مخصوص کروانا بہت مشکل ہوتا تھا۔ ہمارے دوسرے عزیزوں کی نشستیں مخصوص نہیں تھیں اور وہ سب ریلوے اسٹیشن جا کر کھڑے رہتے تھے، اگر کسی ٹرین میں جگہ ملی تو ایک یا دو اس میں بیٹھ کر چلے گئے۔ ہماری نشستیں تیز گام میں تھیں۔ جب

یہ پلیٹ فارم پر پہنچی تو پلیٹ فارم اور ٹرین، دونوں ہی پر زبردست جمِ غفیر تھا۔ ہماری اوّل درجہ کی نشستیں تھیں۔ اس زمانے میں ایئر کنڈیشنڈ، اوّل، دوئم، انٹر، اور تھرڈ کلاس کے ڈبّے ہوتے تھے۔ اب ہم اپنے ڈبّے میں پہنچے تو کوئی دروازہ ہی نہ کھولنے دے۔ کچھ ساتھی دوسرے ڈبّوں کی کھڑکیوں سے اندر گئے، اور پھر اس ڈبّے کے دروازے کو کھول کر ایک ایک کو اندر چڑھایا۔ ابھی سب بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ ٹرین نے بھو پو بجایا اور چل پڑی۔ ہم نے دیکھا تو سب جیسے ایک دوسرے کی گود میں بیٹھے تھے۔ ہم نے ان سب کو مخاطب کیا، ''ارے یہ تم سب کیسے بیٹھے ہو''۔ اب ہم سب اپنی نشستوں کے نمبروں کی تلاش میں نکلے۔ جب وہ ملیں تو وہاں کچھ لوگ براجمان تھے۔ ہم نے وہ نشستیں پہلے اپنے قبضے میں کیں۔ ہم نے اخلاقاً اُن سے کہا کہ کچھ دیر ہم بیٹھیں گے، اور کچھ دیر آپ۔ سارے راستے پانی کا کولر کہیں، تو کھانے کا ناشتہ دان کہیں۔ سب ہی پان کھاتے تھے، لیکن پانوں کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ ہمیں پانی ملا تو ہم نے اپنے عزیزوں کے بچّوں کو تھوڑا تھوڑا پلایا، کہ کھانے اور پانی پر ہمیں راشن لگانا پڑا۔

جن مسافروں کے پاس نشستیں تھیں، وہ حوائجِ ضروری کے لئے بھی اٹھنے کو تیار نہیں تھے کہ اُٹھے اور کرسی گئی ہاتھ سے۔ اندازہ ہوا کہ پاکستانی حکمران کیوں کرسی سے چپکے رہتے ہیں۔ اسی طرح ساری رات گزر گئی اور دوسرے دن ۱۱ بجے صبح کو ملیر کا اسٹیشن آیا تو بہت سے لوگ ملیر پر ہی اتر گئے کہ وہاں سے ٹیکسی لے کر گھر چلے جانا بہتر تھا۔ اب ہم نے پیر سیدھے کئے۔ اس طرح ہم کراچی کینٹ اسٹیشن تک نسبتاً سکون سے پہنچے۔

ہم نے حسبِ معمول اپنے آنے کی کسی کو اطلاع نہیں دی تھی۔ ہم کینٹ اسٹیشن سے گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ گھر پر کوئی نہیں تھا اور تالہ پڑا ہوا تھا۔ مجبوراً قریب ہی ایک عزیز کے گھر گئے۔ یہاں معلوم ہوا کہ کراچی میں گرمی سے قریب کا ٹرانسفارمر اڑ گیا تھا اور بجلی صبح سے غائب تھی۔ لوگ کب سے کہہ رہے تھے کہ ٹرانسفارمر کسی طرح سے واٹر کولڈ ہونا چاہئیں، لیکن کسی کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی تھی۔ اب موٹر نہیں چلے تو اوپر کی ٹنکیوں میں پانی نہیں پہنچتا تھا، لہذا نہ نہا سکیں اور نہ ہی پانی کا کوئی دوسرے استعمال ہو سکے۔ ان کے ریفریجریٹر سے پانی کی بوتل نکال کر تولیہ گیلا کیا اور اس کو چہرے اور گردن پر رگڑ کر کچھ سکون لیا۔ شام کو بجلی بھی آ گئی اور ہمارے بچّے بھی۔ گھر آئے اور نہائے تو اطمینان ہوا۔ اب سوئے ہیں تو دوسرے دن ہی خبر لی۔ صحیح ہے کہ اپنا گھر درحقیقت جنّت ہے۔